PDF Compressor Free Version

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

نائب صدور

جناب سلطان اختر

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

مدیر

مشتاق احمد نوری

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

Mob. 09431080070

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۳۷ شمارہ : ۴

اپریل ۲۰۱۶ء

زرتعاون : دس روپے

سالانہ : سو روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

''زبان و ادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

email : zabanoadabbua@gmail.com

buapat2014@gmail.com

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.org

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

PDF Compressor Free Version

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	مشتاق احمد نوری	۳
مقالات	راج نارائن رازؔ: ادھوری یادوں کا مکمل بیان	مشرف عالم ذوقی	۵
	مادری زبان میں تعلیم: وجود اور شناخت کی ضمانت	شاہد الرحمٰن	۸
	ناصر کاظمی: کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی	ہاجرہ خاتون	۱۲
	طنز و ظرافت کا رشتہ: اہمیت و افادیت	نوشاد احمد	۱۵
	تمنا مظفر پوری کی ڈرامہ نگاری کے چند پہلو	نشاط اختر	۱۷
	قومی یکجہتی کے علمبردار: سرسید احمد خاں	فرحت بانو	۲۰
	غالبؔ کے جدید دور کے نقاد	محمد امان اللہ	۲۲
	اقبالؔ کی وطنی شاعری	راحت افزا	۲۴
	پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید نگاری	محمد عبداللہ	۲۸
افسانے	پنڈ دان	شفیع مشہدی	۳۱
	سانپ سیڑھی	ڈاکٹر اختر آزاد	۳۴
	نیل کنٹھ کی واپسی	ابرار مجیب	۳۹
	چاندنی	شہیرہ سرور	۴۴
منظومات	لمحوں کا حاصل	ڈاکٹر علی عباس امیدؔ	۴۸
	پانچ نظمیں	جمال اویسی	۴۹
	غزلیں	علیم صبا نویدیؔ	۵۱
	غزلیں	شمس فریدی	۵۲
	غزلیں	ڈاکٹر رونق شہری	۵۳
	غزلیں	خورشید طلبؔ	۵۴
	غزلیں	راشد جمال فاروقی	۵۵
	غزلیں	سہیلؔ اختر	۵۶
	غزلیں	فراغؔ روہوی	۵۷
	غزلیں	مشتاق جاویدؔ	۵۸
	غزلیں	شمس قریشی / اشرفؔ مولانگری	۵۹
کتابوں کی دنیا	سہ ماہی دسترس، دھنباد، نارش سہسرامی نمبر	مبصر: ڈاکٹر نسیم اختر	۶۰
	مسرت کے ترانے ضیاء الرحمٰن غوثی	مبصر: محمد شوکت جمال	۶۲
ہماری سرگرمیاں	اکادمی کے زیر اہتمام دو روزہ عالمی اردو کانفرنس کا شاندار انعقاد		۶۴
سلام و پیام	شوکت حیات، نورالحسنین، مہدی پرتاب گڈھی، کرشن بھاوک، جنوںؔ اشرفی، منیر سیفی، سید محفوظ عالم، انور شمیم، ارشد قمر، شکیل سہسرامی، بدنامؔ نظر، امتیاز دانشؔ، ذکی ہاشمی، اسلام احمد شاہی		۶۹

PDF Compressor Free Version

اداریہ

حرف آغاز

آج کل شہرت پسندی کی ہوا چلی ہوئی ہے۔

ہر کوئی اس بات کا تمنائی ہے کہ راتوں رات وہ شہرت کی بلندیوں کو چھو لے اور ہر جانب اس کی واہ واہ ہونے لگے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب میرؔ و غالبؔ سے لے کر پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت، فراقؔ اور مجروحؔ تک نے گیسوئے ادب کو سنوارنے میں پوری زندگی صَرف کر دی اور یہ نہیں سوچا کہ انہیں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوگی یا نہیں۔ غالبؔ جیسے عظیم شاعر کو بھی اپنے زمانے میں شکایت رہی کہ ان کی وہ قدر اور پذیرائی نہیں ہوئی جس کے وہ حق دار تھے، لیکن زمانہ گواہ ہے کہ جتنی پذیرائی غالبؔ کی ہوئی اور ہو رہی ہے وہ آج تک کسی بھی فن کار کی قسمت میں نہیں آئی۔

ممکن ہے کہ کسی فن کار کے اپنے دور میں اس کی تخلیقات کی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں لوگوں سے چوک ہو جائے یا کسی اور بھی وجہ سے اسے نظر انداز کر دیا جائے، لیکن آنے والا وقت ناانصافی کبھی نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ اپنے زمانے کے بہت سے گم نام فن کار بعد کے دنوں میں گہر بن کر چمکے اور کچھ ایسے فن کار بھی ہیں جنہوں نے اپنے زمانے میں اپنی پذیرائی تو کروالی، لیکن بعد میں آنے والی نسل نے انہیں فراموش کر دیا۔

لیکن اب معاملہ قدرے مختلف ہے۔ آج فنکاروں کی جو نئی نسل سامنے آ رہی ہے اس کے نزدیک نہ تو بزرگوں کا احترام ضروری ہے اور نہ ہی ان میں قدروں کی پاسداری پائی جاتی ہے، بلکہ وہ مروجہ قدروں کی پامالی کر کے ہی آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور اسی میں فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنی کرتب بازیوں اور بیان بازیوں سے صرف چونکانے میں مہارت رکھتے ہیں، نامانوس الفاظ کا استعمال، زبردستی نئی نہ تراکیب گڑھنا اور اپنی تخلیق میں ایسا خیال پیش کرنا جس کا نہ تو وجود ہو اور نہ ہی حالات سے کوئی تال میل ہو، وہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ان کی ذہانت زیادہ تر انہی باتوں کی نذر ہو جاتی ہے اور بعد میں ان کے حصے میں ذہنی انتشار کے سوا کچھ نہیں آتا، لیکن اسی نسل میں ایسے فن کار بھی ہیں جو صرف اپنے فن پر بھروسہ کرتے ہیں۔ دیر سویر سہی، لوگ ان کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور ان کی پذیرائی بھی ہوتی ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شہرت پسندی کا یہ رجحان اس قدر کیوں پھیل رہا ہے؟ یا پھر یہ لوگ اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے اس طرح کے حربے کیوں استعمال کر رہے ہیں؟ اگر غور کریں تو اس میں کچھ ان لوگوں کا بھی قصور ہے جو آج بھی پریم چند، میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی دنیا سے باہر جھانکنا پسند نہیں کرتے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان پر ریسرچ نہ ہو یا پھر ان پر گفتگو نہ کی جائے، لیکن کہنا صرف یہ ہے کہ ان کی دنیا سے باہر نکل کر بھی دیکھا جائے کہ ادب کی خدمت کرنے والوں کا قافلہ ابھی ٹھہرا نہیں ہے۔

میرؔ و غالبؔ کا زمانہ گزر گیا، لیکن ان کی تابناکی آج بھی قائم ہے اور اس سے انکار کی گنجائش ممکن نہیں کہ یہ تابناکی ابھی اور بڑھے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تابناکی اس حد تک نہ بڑھا دی جائے کہ دوسروں کی روشنی ماند پڑ جائے۔ اقبالؔ اور پریم چند پر ابھی بھی بحث کی گنجائش ہے، لیکن اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ ہر دور میں کچھ نہ کچھ لعل و گہر پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی گرد بھی صاف کی جائے تاکہ ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔

PDF Compressor Free Version

زمانہ جس تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے، قدریں بھی اسی تیزی سے بدل رہی ہیں۔ تہذیب وتمدن کے نئے نئے پیمانے سامنے آنے لگے ہیں، اس لئے اب لوگوں کے لئے سو سال انتظار کرنا کہ پذیرائی اس کے بعد ہی ممکن ہے، بہت مشکل ہے۔

آج جب ادب پر گفتگو ہوتی ہے تو ایک ہم عصر دوسرے پر نہیں لکھنا چاہتا کیونکہ اسے یہ ڈر ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے سے اس کا اپنا قد چھوٹا ہو جائے گا۔ بڑے چھوٹے پر اس لئے نہیں لکھتے کہ ان کے لئے ان سے بڑے ہی بہت ہیں لکھنے کے لئے۔ چھوٹے بڑے پر لکھیں تو اس کی بات قابل اعتنا نہیں سمجھی جاتی۔ اس طرح سچ پوچھئے تو ایک عجیب سی سچویشن پیدا ہو گئی ہے۔ آج بھی اگر ہر قلم کار اپنے ذہن کے دریچے میں وسعت پیدا کرے تو پھر صورتِ حال کچھ اور ہی ہو گی۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ شہرت پسندی کا غبار ذہن سے نکال کر صرف ایمانداری کے ساتھ اپنے قلم کار جوہر دکھایا جائے۔ اگر فن میں دم ہو گا تو وہ لوگوں کو اپنی جانب متوجہ ضرور کر لے گا۔ ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' والی بات اب بہت دنوں تک چلنے والی نہیں کہ آج کی نسل بہت زیادہ بیدار اور حساس ہے۔

ادب میں کسی کا بھی فرمایا ہوا حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ زمانے کے ساتھ ادب کی قدریں بھی تبدیلی کا شکار ہوتی ہیں اور نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ ہر ادب اپنے عصر سے مطابقت رکھتا ہے یا یوں کہیں کہ ادب اپنے زمانے کا آئینہ ہوتا ہے۔ ادیبوں کا کوئی گروہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کا کوئی قبلہ ہوتا ہے۔ ان کا قلم ان کے ذہن کی طرح ہی آزاد ہوتا ہے۔ انھیں پابند سلاسل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان کی سوچ کو زنجیر سے جکڑا جا سکتا ہے، اس لیے آج ہر قلم کار بغیر کسی دباؤ اور مصلحت کے اپنی سوچ کی دھار پر چلنا شروع کر دے کہ یہ آج وقت کی اشد ضرورت ہے۔

ادب سے تعلق رکھنے والوں کا ایک طبقہ صرف قاری کہلاتا ہے، وہ بہت ذہین ہوتا ہے اور ایک قابل ''امپائر'' کی طرح اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے جس سے اختلاف کی گنجائش ہو تو سکتی ہے لیکن وہ فیصلہ ''کھلاڑی'' کے لیے ہر لحاظ سے اور ہر حال میں قابل قبول ہوتا ہے۔

اردو ادب کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے قارئین بہت ذہین ملے ہیں کیوں کہ انہوں نے جسے نکار دیا اسے کوئی ناقد بھی نہیں بچا سکا جسے اُٹھا دیا اسے کوئی گرانے کی بھی جرأت نہیں کر سکا۔ ان کی ''امپائرنگ'' ابھی تک ایسی رہی ہے کہ اس سے اختلاف کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔

لیکن کیا آپ نے کبھی ایسا محسوس کیا ہے کہ اب کسی نہ کسی طور سے ''تیسرے امپائر'' کی بھی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے؟

PDF Compressor Free Version

مشرف عالم ذوقی

D-304, Taj Enclave , Geeta Colony , Delhi 110031

راج نارائن رازؔ: ادھوری یادوں کا مکمل بیان

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

رازؔ صاحب ایک مخلص انسان تھے۔ دوراندیش تھے۔ صحافت وادب کی دنیا میں وہ ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتے تھے، جو آج کے نظام سے مختلف تھا۔ ان کے میدان عمل اور دائرہ کار میں سختی اور ایمانداری کو دخل تھا، انہوں نے اپنے اردگرد ایک ایسی مقناطیسی دنیا آباد کر رکھی تھی، جہاں ملنا تو آسان تھا، لیکن ان کی گہری آنکھوں سے آنکھیں ملانا مشکل، اس لیے زیادہ تر ایسا ہوتا کہ ان سے ملاقات کی خواہش رکھنے والے، ان سے ملنے تو آجاتے، لیکن روکھی سوکھی گفتگو کے فوراً بعد ہی واپس لوٹ جاتے۔ میں نے جہاں تک محسوس کیا، رازؔ صاحب کوئی مجلسی آدمی نہیں تھے، مگر ادب کے سچے پارکھ تھے اور اسی لیے ہر شخص کی رسائی ان تک ممکن نہیں تھی۔

وقت گزر گیا، لیکن ان کے علمی وادبی مرتبے، قلندرانہ شان، بلند کردار، اعلیٰ ظرفی، قابل تقلید انکساری کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ادب کی سنجیدہ قدروں کے ترجمان تھے۔ وہ سرتاپا ادب میں ڈوبے ہوئے تھے اور جو مقناطیسی یا قلندرانہ شان ان میں پیدا ہوئی تھی، وہ اسی ادب کا حصہ تھی۔ وہ پرانی روایتوں کے رازدار تھے اور جہاں تک مجھے علم ہے، ان کا کوئی راز دارانہ تھا۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کرتے تھے۔ آنکھوں پر زیادہ پاور کا چشمہ لگا تھا۔ آپ اگر ان کے سامنے بیٹھے ہوں تو چشمہ کے اندر سے ان کی گہری آنکھیں ''ایکس رے'' مشین کی طرح آپ کے اندر اتر جاتی تھیں۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی تصور کرتا ہوں کہ ایک مشفق اور مربی استاذ کی طرح کئی موقعوں پر اپنے تحفظات کا خیال کیے بغیر انہوں نے مجھے ادب اور زندگی کے مشکل ومختلف پہلوؤں کے بارے میں سمجھایا، مفید مشوروں سے نوازا اور شاید زندگی کا وہ راستہ بھی دکھایا، جہاں میں آج مضبوطی اور طمانیت کے احساس کے ساتھ کھڑا ہوں۔

آپ کسی اجنبی دیار، کسی نئے شہر میں قدم رکھتے ہیں تو اچانک کوئی معجزہ نہیں ہوتا۔ کچھ شخصیتیں ہوتی ہیں، جو آپ کی زندگی کا رُخ موڑ دیتی ہیں۔ میں ۱۹۸۵ء میں دلی آیا، عمر تھی تیئیس سال، اس وقت دلی ہم جیسے نوجوانوں کے لیے ایک خواب ہوا کرتی تھی۔ دلی فتح کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی، لیکن ادب کی بلندیوں کو چھو لینے کی خواہش اسی زمانے میں پیدا ہوئی۔ اس وقت ہندی میں ''دھرم یگ'' اور ''ساریکا'' ایسے رسائل میں شمار ہوتے تھے، جن میں شائع ہونے کا مطلب تھا، راتوں رات آپ اسٹار بن گئے۔ اردو میں یہ حیثیت صرف ''آج کل'' کو حاصل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندی کے شہرت یافتہ ادیب راجندر یادو نے ''ہنس'' شائع کرنا شروع کیا تھا، میری دلچسپی ہندی زبان میں بھی رہی ہے، لیکن دلی پہنچنے کے بعد میں جن دو ہستیوں سے ملنے کا خواہش مند تھا، ان میں ایک رازؔ صاحب تھے اور دوسرے راجندر یادو۔ راجندر یادو سے ملنا آسان تھا جب کہ رازؔ صاحب کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ زیادہ ملنا ناپسند نہیں کرتے۔ کم سخن ہیں، احتیاط پسند بھی اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ راجندر یادو سے پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو گیا اور یہ سلسلہ ان کی زندگی تک چلتا رہا۔ رازؔ صاحب سے ملاقات کی خواہش تو تھی مگر ساتھ ہی یہ خوف بھی کہ پتہ نہیں وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔

ماہیاں از پیر آگہہ ما بعید
عاشقی از دولت و ایشاں سعید

پانی میں رہنے والی مچھلیاں تک پیر کے مقام سے آگاہ ہیں اور میں عاشق ہو کر بھی اجنبی۔ یہ پہلا خیال تھا، جو رازؔ صاحب سے ملاقات کے بعد میرے دل میں پیدا ہوا، وہ یاد اب بھی تازہ ہے۔ میں نے جینس پہن

PDF Compressor Free Version

رکھی تھی۔اس زمانے میں کافی دبلا پتلا تھا۔ جینس کے اوپر ٹی شرٹ، پتہ نہیں، اس حلیہ میں، میں مسخرہ نظر آرہا تھا یا جوکر، جس نے اچانک ماہنامہ ''آج کل'' کے کھلے دروازے سے اندر آکر ادب کے سلطان کی تنہائی میں خلل پیدا کردیا تھا۔ میں اندر سے سہما ہوا تھا، مگر آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ چشمے سے جھانکتی آنکھیں دیر تک میرا جائزہ لیتی رہیں۔

از شہانم ہیبت و ترسم نبود
ہیبت این مرد ہوشم را ربود

میں شاہوں کے خوف کا قائل نہیں رہا، لیکن ادب کے اس حجرے میں، میری طرف جھانکتی آنکھیں مجھ میں ہیبت پیدا کررہی تھیں۔ اچانک مرد درویش کے چہرے پر مسکراہٹ آئی، میں نے نام بتایا، مسکراہٹ مزید گہری ہوئی اور پہلا سوال ہوا:

''لڑکے، فلموں میں کیوں نہیں جاتے.....''

''جی—''

میں رازؔ صاحب کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ مجھ سے میری زندگی اور کیریر کو لے کر کچھ سوالات کیے، پھر کہا:

''کہاں دوردرشن ہے، اپنی جگہ سیریل میں تلاش کرو، یہاں تمہیں کامیابی ملے گی۔''

یہ سطور لکھتے ہوئے وہ چہرہ ایک بار پھر میری آنکھوں کے آگے زندہ ہوگیا ہے۔ نعرۂ مستانہ خوش می آیدم، میں قیامت تک اس نعرۂ مستانہ کا دیوانہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ پہلی ملاقات، پہلی تربیت تھی۔ انہوں نے میرے اندر اس کیمیا کی خاصیت تلاش کرلی تھی، جو مجھے ٹی وی چینلس اور میڈیا کی نئی دنیا کا راستہ دکھا سکتا تھا، پھر یہ راستہ بھی انہوں نے آسان کیا۔ ایک دن اچانک ان کا فون آیا۔ ذرا ٹھہریے، یہ بتادوں کہ اُس زمانے میں موبائل کا رواج نہیں تھا۔ میں ایک چھوٹے سے کرایہ کے کمرے میں تین دوستوں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے کمرے کے ٹھیک سامنے ایک کوشچن فیملی تھی۔ میں نے رازؔ صاحب کو ان کا فون نمبر دیا تھا۔ مسرت کی بات یہ تھی کہ فون نمبر ان کے پاس محفوظ تھا۔ انہوں نے فون پر وقت دے کر بلایا۔ یہاں میری ملاقات ایک خاتون سے ہوئی جو دوردرشن کے لیے پروگرام بنانے میں دلچسپی رکھتی تھیں اور کشمیر سے کسی کی سفارش لے کر رازؔ صاحب سے ملنے آئی تھیں۔ ان کو اسکرپٹ رائیٹر کی تلاش تھی اور اس طرح ''صبح صبح'' کے عنوان سے میں نے پہلا سیریل دوردرشن کے لیے لکھا اور پھر یہ اجنبی راستے ایسے کھلے کہ میں آج بھی ان راستوں کا مسافر ہوں۔ یہ درویش کی خوبی کہ وہ آپ میں آنے والے کل کو دیکھ لیتے ہیں۔

پبلی کیشنز ہاؤس کی بلڈنگ میں ''آجکل'' کا یہ کمرہ اس وقت میرے لیے ایک جانا پہچانا کمرہ بن گیا، جب یہاں خورشید (خورشید اکرم) سب ایڈیٹر بن کر آگئے۔ پہلے رازؔ صاحب سے جو ملاقات کبھی کبھی ہوتی تھی، اب وہ ملاقات روز کی ملاقات بن گئی۔ ان دنوں کی اپنی خوبصورت آوارگیاں تھیں، لیکن خورشید کے آنے کے بعد رازؔ صاحب کو قریب سے دیکھنے، جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ہم تمام دوست ان کے لیے ''لڑکے'' تھے۔ ''لڑکے'' کی ادائیگی وہ اتنی محبت سے کرتے کہ آج بھی ذہن کی کسی گوشے میں اس لفظ کی ہلچل سنائی دے جاتی ہے۔ ''لڑکے! یہ ایسے نہیں ہوتا، لڑکے، اس نظریہ سے دیکھو تو بات سمجھ میں زیادہ آئے گی..... نہیں لڑکے، ادب بازار میں بکنے والا کھلونا نہیں ہے۔'' کسی کتاب پر تبصرہ کرانے کی بات آئی، خورشید نے کسی بڑے شاعر کا نام لیا جو کتابوں پر تبصرے بھی کیا کرتے تھے۔ رازؔ صاحب نے گردن اٹھا کر خورشید کو دیکھا، ایسی مسکراہٹ کہ خدا نے فرشتوں کو بھی عطا نہ کی ہوگی۔ آنکھوں میں چمک لہرائی، محبت میں کہا گیا:

''لڑکے..... یہ تاریخ کی کتاب ہے..... تم بتاؤ، اُس آدمی کو تاریخ سے شغف کب رہا.....؟''

''جی—''

''کسی ایسے آدمی کو پکڑو لڑکے، جس کا تاریخ کا مطالعہ وسیع ہو۔''

ایک مدت گزر چکی ہے، یہ واقعات ذہن پر نقش ہیں۔ وقت کے ساتھ ادب کے تئیں ذمہ داریاں ختم ہوچکی ہیں۔ تبصرہ کھیل ہے۔ کوئی بھی تبصرہ کردیتا ہے، لیکن رازؔ صاحب ان معاملوں میں سخت تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فلاں کتاب تبصرے کے لیے کس کو دی جاسکتی ہے۔ ادب کی مختصر سی دنیا کے حالات وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ وہ

PDF Compressor Free Version

زمانہ تھا جب معیار کی سختی کو لے کر ان کو نشانہ بھی بنایا گیا۔ مجھے یاد ہے، ایک بار وہ ستیش بترہ کے سفرنامہ ''جوئے لداخ'' کو لے کر پریشان تھے۔ یہ سفرنامہ قسط وار شائع ہوا تھا۔ وہ شکایتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ صرف یہی بتایا کہ اس سفرنامہ کو لے کر انہیں خاصہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ درد کو بانٹنا انہیں منظور نہ تھا، ہاں دوسروں کے درد میں شامل ہونا وہ ضرورت سے زیادہ انسانی فرائض میں تسلیم کرتے تھے۔

''آجکل'' محض ایک رسالہ نہیں تھا، ایک خاندان تھا۔ خورشید اکرم، مدبرہ عثمانی (جنہیں وہ پیار سے بٹی کہہ کر بلایا کرتے تھے اور اتنے پیار سے کہ مجھے یقین ہے کہ اس لفظ کے ادا ہوتے ہی رقص کرتے ہوئے فرشتے ضرور کمرے میں آجایا کرتے ہوں گے) اور اب میں بھی اس خاندان کا فرد ہو گیا تھا۔ لنچ کا وقت ہوتا تو سب ایک ساتھ لنچ کرتے۔ مدبرہ گھر سے لنچ لایا کرتی تھیں۔ خورشید کینٹن سے کچھ منگا لیتے۔ مجھے خیال ہے کہ ساتھ بیٹھ کر لنچ کرنے کا یہ سلسلہ رازؔ صاحب کے زمانے سے ہی شروع ہوا، پھر یہ سلسلہ آگے بھی قائم رہا اور اب تک قائم ہے۔ نفسیاتی سطح پر اگر غور کریں تو یہ ایک دوسرے کو قریب سے سمجھنے اور جاننے کی ایک ضرورت ہے۔

''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی'' ہم ایسے معاشرے کا حصہ بن گئے جہاں وش کو متھ کر امرت نکالنے والے رخصت ہو گئے۔ اب ''فاصلوں'' کا زہر ہے اور زخمی کندھوں پر مٹتی ہوئی تہذیب کا جنازہ ہے۔ جیسا میں نے مندرجہ بالا سطور میں بتایا کہ ''آجکل'' کا یہ کمرہ محض ایک کمرہ نہیں تھا، ایک خاندان تھا۔ تہذیبی و ثقافتی صورت حال میں اب ایسا خاندان دور دور تک نظر نہیں آتا۔

ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آرہا ہے۔ میرے ایک دوست تھے اوم پیوش، انہوں نے میرے کہنے سے ''آجکل'' میں فون ملایا، فون خورشید نے اٹھایا، اوم نے کہا:

''ذوقی چلے گئے۔ سڑک کراس کر رہے تھے کہ سامنے سے ایک گاڑی آرہی تھی.....'' ایک تیز چیخ بلند ہوئی۔ میرے ہنسنے کی آواز پر فون رازؔ صاحب نے اٹھایا:

''لڑکے جان لو گے کیا..... کوئی ایسا مذاق کرتا ہے.....''

وہ سرتاپا محبت تھے، سخت گیر بھی۔ وہ ایک ایسے استاد تھے، جو اپنے لیے نہیں سوچتے تھے، ان کی شفقتوں اور محبتوں کے لیے یہ ایک دنیا بھی کم تھی۔ وہ ایک سنجیدہ شاعر تھے، لیکن اس سے کہیں زیادہ ایک عظیم انسان۔ میں اکثر ان کی میز سے، دور دراز سے آئے ہوئے خطوط کو پڑھ لیتا تھا۔ کچھ نام مجھے آج بھی یاد ہیں۔ یہ ایسے نام تھے جو اس وقت ادب کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہ تھے، لیکن ان کی خواہش تھی کہ اگر کوئی ایک تخلیق بھی ''آجکل'' میں شائع ہو جائے تو ان کی شناخت بن جائے گی۔ کیا آج آپ کسی ایڈیٹر یا کسی رسالہ کے بارے میں یہ بات کہہ سکتے ہیں؟

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ماضی کی سرنگوں میں یادوں کے دیئے اب بھی روشن ہیں۔ ابھی بھی کئی کہانیاں ہیں، جو یاد آرہی ہیں، آنکھیں نم ہیں، بیتے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں، تنہائی جنہیں دہراتی ہے۔ چھوٹے سے شہر آرہ سے دلی آنے کے بعد رازؔ صاحب کی شکل میں ایک ایسا شفیق استاد ملا جس نے نہ صرف زندگی کے تجربات کو سمجھا کیا بلکہ بتایا کہ مجھے کن راستوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ دلی آنے کے بعد جن لوگوں کا میری زندگی پر حق ہے، ان میں پہلا نام راج نارائن رازؔ کا ہے۔ نعرۂ مستانہ خوش می آیدم، میں قیامت تک اس نعرۂ مستانہ، کا دیوانہ رہنا چاہتا ہوں۔ ❁❁

ضروری وضاحت

''زبان وادب'' کی زیر نظر اشاعت کے حصہ مقالات میں پہلے مقالے کے علاوہ تمام تر ریسرچ اسکالرز کی نگارشات ارادتاً شامل کی گئی ہیں۔ ان میں بہار اور بیرون بہار کی مختلف یونیورسٹیوں کے طلبا و طالبات شامل ہیں اور اسے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارے جو نوجوان طلبا و طالبات مختلف موضوعات پر اپنی اپنی جامعاتی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی ہو۔

——ادارہ

PDF Compressor Free Version

شاہد الرحمٰن
E 92/1, 4th Floor, Street No.6
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi 110025 (Mob.9953078646)

مادری زبان میں تعلیم: وجود اور شناخت کی ضمانت

علم وہ واحد سیڑھی ہے جو انسان کو خدا تک پہنچاتی ہے۔ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ علم ہی نے ''آدمی'' کو ''انسان'' کے درجے سے فیض یاب کیا۔ بہت سے لوگ ''آدمی'' اور ''انسان'' کو ہم معنی سمجھتے ہیں، مگر یہ بڑی ناسمجھی اور غفلت کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے اور شاید اتنا ہی بڑا فرق جتنا کہ ''آدمی'' اور ''انسان'' میں ہوتا ہے! غالبؔ نے یوں ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ ع

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آدمی سے انسان بننے کے مراحل طے کرتے ہوئے اس ذی روح نے جس ایک چیز کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا اور اسی کی بدولت تمام مراحل کامیابی سے طے بھی کر پایا، سوائے علم کے وہ کچھ اور شے نہیں ہے، پھر انسان کو علم کے محفوظ کر لینے کا خیال آیا اور اسی کے تحت ''لفظ'' وجود میں آیا کیوں کہ ''ضرورت ہر ایجاد کی ماں'' جو ٹھہری! لفظ کے بننے، اس کے استعمال یعنی بولنے اور لکھنے کے مراحل سے گزرنے کے بعد، انسان وہاں پہنچا، جہاں اسے ہم آج دیکھ رہے ہیں۔

زبان جسے عربی میں لسان کہا جاتا ہے، بنیادی طور پر الفاظ کا وہ گروہ یا جماوڑا ہے جس کی وجہ سے ہم قابل ترسیل ہوتے ہیں۔ ہم اپنے خیالات و جذبات کی منتقلی کے لئے اسی کے غلام ہیں، مخاطب بھی انہی کے سہارے ہم تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ مادری زبان سے مراد وہ پہلی زبان ہے جسے ایک بچہ اپنے گھر میں سیکھتا ہے، لیکن کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ عمر کے ہر مقام پر اس زبان میں گفتگو کے قابل بھی ہو۔ ایسی حالت میں وہ دوسری زبان، جو وہ سیکھتا ہے، جسے وہ گفتگو میں استعمال کرتا ہے، اس کی مادری زبان بن جاتی ہے۔ کوئی ایسا شخص جس نے کم عمری میں ایک ساتھ دو زبانیں سیکھی ہوں، اس کی مادری زبان، وہ زبان ٹھہرے گی جس کا استعمال وہ اپنی تعلیمی زندگی کا سفر شروع کرنے سے پہلے، سب سے زیادہ کرتا ہو۔ کسی شخص کی ''دو'' مادری زبانیں تب ہی مانی جائیں گی جب وہ دونوں زبانوں کا استعمال برابر برابر کرتا ہو اور دونوں ہی زبانوں میں یکساں فراغت کا حامل ہو۔ عام طور پر ایسے لوگ یا تو کمیاب ہیں یا پھر ایسا ہونا حسن اتفاق! وہ بچہ جس نے ابھی بولنا بھی شروع نہیں کیا ہے، اس کی مادری زبان وہ زبان ہوگی جس کا استعمال اس کے گھر میں عام ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے یا پھر یوں کہیں کہ اس کے گھر میں اس کے والدین جس زبان کا استعمال سب سے زیادہ کرتے ہیں۔ ایسے ''بے زبان'' بچوں کی دو مادری زبان تب ہو جائے گی جب اس کے گھر میں دو زبانیں برابر برابر بولی جاتی ہوں اور اسی وجہ سے دونوں زبانوں کے بولنے پر اس نے وقت کے ساتھ عبور حاصل کر لیا ہو۔

زبان بلاشبہ انسان کی تہذیب اور وجود کی روح ہے اور ترسیل کا سب سے کارآمد آلہ۔ زبان فکر، جذبات، احساسات کے تبادلے کا سب سے بہتر وسیلہ ہے۔ اپنی زبان سے واقفیت کا مطلب ہی اپنی شناخت، وجود، تہذیب و تمدن کو قائم و دائم رکھنا ہے۔ فی زمانہ تہذیبی افکار اور آگہی کا زور کافی بڑھا ہے، اسی لئے، مثال کے طور پر، اردو کی بہ طور تہذیب، قبولیت عام ہوئی ہے۔ ایسے حالات میں جب کہ بالی ووڈ کی فلمیں، عالمی پیمانے پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو رہی ہیں، تہذیبوں کے ملغوبوں کو پھر سے متعارف کرنے کی ضرورت در آئی ہے۔ یہ عمل صرف فلموں کی حد تک محدود نہیں بلکہ ایسے بہت سارے معاملات ہیں جو عالم کاری کے عمل کے تحت دنیا کے کونے کونے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کوئی شے یا کوئی خیال، مکمل طور پر ہندستانی یا کسی مخصوص خطے کی پیداوار ہونے کے باوجود، پوری دنیا میں

PDF Compressor Free Version

آسانی سے مہیا ہونے کی وجہ سے، اپنی علاقائی شناخت کھوکر، عالمی ''ٹیگ'' حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہندستانی وجود پذیر کوئی فکر یا شے جب عالمی شہرت حاصل کر لیتی ہے تو ہندستانی نژاد افراد کو اپنی شناخت کے ادعا کا حقدار بناتی ہے اور اپنی وطنی زبان اور ورثے کا جشن منانے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

زبان محض ترسیل کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ بہت کچھ اور بھی ہے، یہ کسی قوم کی اجتماعی تاریخ اور ورثے کا مخزن اور شوروم بھی ہے۔ یہ انسان کو شناخت بھی مہیا کرتی ہے اور قوموں کو مضبوطی سے ایک دوسرے سے باندھے بھی رکھتی ہے، ساتھ ہی انفرادی حصولیابیوں کو آسان اور سہل بھی بناتی ہے۔ اردو کی انٹرنیٹ پر خاطر خواہ موجودگی کی وجہ سے، اس کے ادب اور خاص طور پر بالی ووڈ میں اس زبان میں لکھے اور گائے گئے گانوں کا پوری دنیا میں بھرپور لطف اٹھایا جاتا ہے۔ کباب، مہندی، سجدہ، عشق، سلام، جنگل جیسے الفاظ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی بڑی آسانی سے بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔

مادری زبان میں تعلیم انسان کو اس کی جڑ اور منبع سے جوڑتی ہے اور وہ یہ ورثہ اپنے بچوں کو منتقل کر دیتا ہے۔ نتیجتاً وہ اپنی آنے والی نسلوں کے لئے اپنی تہذیب کو محفوظ کر لینے میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ کثیر لسانی اور کثیر تہذیبی سماجوں میں، غیر علاقائی اور غیر نژادی اقوام کے ذریعہ اپنی زبان کا تحفظ، ان کے منفرد وجود اور شناخت کے لئے اشد ضروری ہے۔ اس کے دوسرے فوائد بھی ہیں، مثلاً اگر کسی بچے نے اپنی مادری زبان میں مہارت حاصل کر لی ہے تو قدرتی طور پر وہ اپنی اس خوبی کا استعمال دوسری زبانوں میں مہارت حاصل کرنے میں کرے گا، اپنی مادری زبان کی طرح وہ غیر واقف الفاظ کے معنی کا اندازہ لگا کر متن کو سمجھنے کی کوشش کرے گا اور وہ اہم الفاظ جن کے علم کے بغیر کسی متن کی تفہیم ممکن نہیں، ان کی شناخت بھی وہ بہ آسانی کر پائے گا اور ساتھ ہی ان الفاظ کو جو کہ غیر اہم ہیں، چھانٹ کر الگ کر دینے کا بھی اہل ہو پائے گا۔ اس طرح اپنی مادری زبان میں سیکھی گئی منطق اور دلیل کو وہ دوسری زبانوں کے علوم اور مضامین کی تفہیم میں بھی استعمال کرے گا اور نتیجتاً وہ بحث کو مثبت اور کامیاب نتائج سے ہم کنار کرنے میں کامیاب ہوگا۔

کچھ لوگ ہجرت کر کے دوسرے ممالک اور خطوں میں جا کر بس جاتے ہیں جہاں ان کی مادری زبان کا نہ کوئی بولنے والا ہوتا ہے اور نہ کوئی آشنا۔ ان حالات میں وہ اپنی مادری زبان کو فراموش کر دینے کی حد تک اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ معاملات تب بگڑتے نظر آتے ہیں جب وہ اپنے آبائی مقام کی طرف لوٹتے ہیں۔ وہ خود کو اجنبیت کا شکار محسوس کرتے ہیں کیونکہ اب اس جگہ ان کی نئی سیکھی گئی زبان کا آشنا کوئی نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں وہ اپنا تعلیمی سفر جاری رکھ پاتے ہیں نہ ہی کاروباری۔ وہ اپنے والدین، بوڑھے بزرگ، اعزا و اقربا اور دوست احباب سب سے کٹ جاتے ہیں اور ایسے تمام تر افراد کے ساتھ خود کو غیر مطمئن محسوس کرتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے ایک اہم عضو، یونیسکو (UNESCO) نے جسے تعلیم اور تہذیب و ثقافت جیسے اہم ترین امور کی عالمی پیمانے پر نگرانی کی عصری ذمہ داریوں سے سرفراز کیا گیا ہے، سب سے پہلے مادری زبان کی اہمیت و افادیت کے اعتراف میں ''بین الاقوامی مادری زبان کا دن'' کا اعلان ۱۷ نومبر ۱۹۹۹ء کو کیا اور ۲۱ فروری ۲۰۰۰ء سے باضابطہ اس دن کو دنیا بھر میں دھوم دھام سے منایا گیا۔ ۲۰۱۵ء میں اس کی پندرہویں سال گرہ پوری دنیا میں جوش و خروش سے منائی گئی۔ اسی بابت اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۶ مئی ۲۰۰۷ء میں ایک قرارداد کے تحت ۲۰۰۸ء کو ''زبانوں کا بین الاقوامی سال'' قرار دیا۔ اس قرارداد کے تحت طے پایا کہ دنیا کی تمام تر زبانوں کا تحفظ اور فروغ و اشاعت ایک اہم ذمہ داری ہے کیوں کہ اسی سے کثیر تہذیبی معاشرے کی بقا ممکن ہے۔ ۲۱ فروری کا انتخاب ایک خاص تاریخی واقعے کا اشاریہ ہے۔ دراصل اسی دن ۱۹۵۲ء میں بنگلہ دیش میں طالب علموں کی ایک جماعت نے ''بنگلہ'' کو اردو کے بعد دوسری قومی زبان کی حیثیت سے درج کرانے کے لیے پرزور احتجاج کیا تھا۔ پولیس نے ان پر گولی چلائی اور دو لڑکے جاں بحق ہو گئے۔ انہی کی قربانی کے اعتراف میں اقوام متحدہ نے اس تاریخ کا انتخاب کیا۔ اقوام متحدہ کا ماننا ہے کہ:

> ''لسانی اور غیر لسانی، ہر قسم کے انسانی ورثہ کی حفاظت، اس کا تحفظ، ترویج، فروغ وغیرہ کا سب سے اہم اور کارگر

PDF Compressor Free Version

وسیلہ زبان ہے۔ مادری زبان کی نشر واشاعت کے لیے اٹھایا گیا ہر ایک قدم نہ صرف یہ کہ لسانی تنوع اور کثیر لسانی تعلیمی ماحول کو تقویت بخشے گا بلکہ عالمی پیمانے پر کثیر لسانی اور کثیر تہذیبی بیداری کا آغاز بھی ہوگا اور اس کی بنیاد میں افہام وتفہیم، رواداری اور مکالمہ بہ حیثیت ستون کام کریں گے۔" (بحوالہ: اقوام متحدہ جنرل اسمبلی قرارداد A/RE/61/266، ۱۶ر مئی ۲۰۰۷ء)

حالاں کہ اس قسم کے انقلابی اقدام کی شروعات ۱۹۵۲ء میں ہی ہوگئی تھی، مگر اقوام متحدہ نے اس کا اعتراف دیر سے کیا۔ خیر، دیر آئے، درست آئے! لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس قرارداد کے پاس ہوجانے کے کیا معنی ہیں؟ کیا عالم کاری کے عمل کو یہ کسی بھی طور پر متاثر کرتا ہے؟ یہ اعتراف لسانی تحریک کا اعتراف ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ ہر ایک قوم، نسل اور ملک کا بنیادی اور پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنی زبان میں ترسیل کرے، اس میں بولے اور روابط قائم کرے۔ اس سے زبانوں کا تنوع بھی برقرار رہے گا اور ثقافتی شناخت بھی قائم رہے گی۔

اقوام متحد کے مطابق دنیا بھر میں پانچ سے ساڑھے سات کروڑ ایسے "حاشیائی" بچے ہیں جن کا داخلہ اسکولوں میں کبھی ممکن ہی نہیں ہو پایا۔ اس کی بنیادی وجہ کچھ ایک خاص مراعات یافتہ زبان پر زور، ان کے استعمال پر اصرار اور ان کو اسکولوں میں تعلیم کا لازمی میڈیم قرار دیا جانا ہے۔ اس کے نتیجے بڑے ہولناک ثابت ہوئے مثلاً خوف اور اندیشوں کے مدنظر والدین کا بچوں کو اسکول میں یکسر داخل ہی نہیں کرانا، علم وتعلیم میں بچوں کی دلچسپی کا فطری فقدان، اساتذہ کی شکایت کے بموجب بچوں میں کم توجہی کی کمی کی وجہ سے کچھ نیا سیکھنے کے جذبے میں خاطر خواہ کمی، بچوں میں تعلیم کی طرف انہماک اور توجہ کی کمی، علم کے حصول کے شغل کو ہی بے وجہ اور فالتو سمجھ لینا وغیرہ۔ ایسے حالات کے پیش نظر، مندرجہ بالا تمام تر مصائب کا واحد حل، بچوں کو اپنی پسند کی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت اور رعایت دینا ہے اور ظاہر ہے یہ مادری زبان کے علاوہ دوسری کوئی بھی زبان ہو ہی نہیں سکتی۔ مہاتما گاندھی نے شاید اسی لئے کہا تھا کہ:

"ہندستان کے لیے سب سے عالی ظرف، عظیم اور نایاب خدمت، مادری زبان کے میڈیم کے اسکولوں کا قائم کرنا ہے اور یہ کارنامہ ہر ہندستانی کو انجام دینا چاہیے۔"

مقولہ مشہور ہے "ترقی مزید ترقی کی رہبر ہے"۔ یہ مقولہ مادری زبان میں تعلیم وتربیت پر بھی یقیناً صدفی صد صادق آتا ہے۔ شروعاتی مراحل میں جب کہ بچہ مادری زبان کا اسیر ہوتا ہے، اس کی قرأت کی صلاحیت مادری زبان میں ہی پھلتی پھولتی ہے، اس کی یہ صلاحیت دوسری زبانوں کی قرأت میں بھی معاون ومددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے بلکہ حقیقت کا آئینہ دار ہے، ماہرین لسانیات کی رائے ہے اور کئی ریسرچ کا نتیجہ بھی ایسا ہی ہے۔ ایسا بنیادی طور پر اس لئے ہوتا ہے کہ قرأت کا ہنر منتقل ہونے والی شے ہے، قرأت کے ذریعہ نئے الفاظ سیکھے جاتے ہیں جس کی وجہ سے دوسری زبانوں کے متن کی تفہیم میں کافی سہولت ہوتی ہے اور پھر ان سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرأت کا عمل بذات خود اس قدر وائقہ دار ہوتا ہے، اس کا نشہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسری زبانوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے، کیوں کہ اس نشہ کی وجہ سے قاری خود کو محض اپنی زبان کی حدود تک مقید نہیں رکھ پاتا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دوسری زبانوں میں تیز رفتار اور پر اثر علم کا حصول تبھی ممکن ہوسکتا ہے جب مادری زبان سے رشتہ مضبوط ترین ہو اور اس میں بھی علم کے حصول کا عمل جاری وساری ہو۔

ہم عصر عہد بین مضامینی طریقہ کار سے ہم معنی ہے۔ آج وہی حضرات کامیاب وکامران ہیں جو اپنے موضوع کے علاوہ دنیا کے دوسرے علوم پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں، جو Jack of all tracks and master of none ہیں۔ شاید یہی مکمل ترقی اور کامرانی کی وجہ بھی ہے کیوں کہ جو کنویں کا مینڈھک ہوتا ہے، اس کی نگاہ سطحی اور محدود ہوتی ہے اور جو سمندر کی کھلی فضا میں سیر کرتا ہے اس کا مطمح نظر وسیع، بالغ اور گہرا ہوتا ہے اور ایسے ہی لوگ دوررس اثرات مرتب کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ قانون صرف درس وتدریس پر ہی نہیں بلکہ دنیا کے دیگر تمام علوم وفنون پر بھی یکساں طور پر نافذ ہوتا ہے۔

عہد حاضر میں شمس الرحمان فاروقی اور گوپی چند نارنگ جیسے

PDF Compressor Free Version

حضرات نابغہ روزگار، اردو تنقید کے آسمان کے درخشاں ستارے صرف اس وجہ سے بن پائے ہیں کہ انہوں نے خود کو اردو کی دنیا تک ہی محدود نہیں کیا بلکہ وہ عالمی ادب پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں، ان میں صبح وشام غوطے لگاتے ہیں اور ان کی لائق اعتنا تھیوریوں کو اردو میں بھی متعارف کرتے ہیں کہ اردو کی محدود دنیا میں وسعت ہو اور اردو کے عام قارئین بھی ان سے استفادہ کرسکیں۔ پچھلے بزرگوں میں بھی اس قسم کی مثالوں کی کثرت ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری اردو کی وجہ سے کم، فلسفہ اور اسلامی حقائق کو اردو شاعری کے میڈیم سے قارئین تک پہنچانے کی وجہ سے زیادہ مقبول ہے۔ کلیم الدین احمد اور فراق انگریزی کے پروفیسر تھے۔ غالب، میر، فیض کی دنیا کو صرف اردو کی حد تک محدود کرکے دیکھیں تو بظاہر معلوم ہوگا کہ ایسے شعرا کیلو کے بھاؤ سے مل سکتے ہیں، مگر ایسا نہیں کیوں کہ ان حضرات نے اردو کے علاوہ فارسی، عربی، فلسفہ، تصوف، سماجیات، سائنس، حکمت وغیرہ کو اپنی تخلیقات کا غیر مکسور اور کامل حصہ بنایا اور اردو زبان میں پروکر ایک مستحکم اور عظیم روایت قائم کرنے میں کامیابی درج کی۔ یہاں ان مثالوں کو یکجا کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف باور کرانا یہ ہے کہ مادری زبان میں تعلیم اور درس وتدریس، ترقی کے وہ خیابان اور مواقع فراہم کرتی ہے جن کو بنیاد بنا کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں ایسی خاطر خواہ کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے جو کسی اور طریقے سے درج نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات یقینی ہے کہ مادری زبان میں تعلیم اور اس کا اثر آسانی سے ذہن کی طرف منتقل ہوجانے والا ہے۔

عالم کاری کے اس عہد میں جب کہ تقریباً ہر قفل ٹوٹ چکا ہے، تمام وسائل لامحدود ہوگئے ہیں، ہر کسی کی ہر چیز تک رسائی ممکن ہے، علم جو کہ یوں ہی غیر مقید ہے، جس کی خود کوئی سیما نہیں، اس کو جعلی سیمائیں کب تک اور کس حد تک روک سکتی ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ عالم کاری کا فائدہ سب سے زیادہ علم کے تبادلے میں ہوا۔ اب علم وتعلیم کی کوئی جامد حد نہیں ہے۔ انٹرنیٹ اور ہجرت نے اس کام کو اور بھی آسان بنادیا ہے۔ آج دنیا کے بیش تر ممالک کی یونیورسٹیز میں غیر ملکی اور خارجی زبانوں کا باضابطہ شعبہ موجود ہے۔ امریکہ، یوروپ، خلیجی ممالک، جاپان وغیرہ میں باضابطہ ہندستانی زبان اور خاص طور پر اردو کی درس وتدریس کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ اس کی وجہ سے مخلوط اور کثیر تہذیبی لوگوں کا ایک قافلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور دنیا کے بیش تر علاقوں میں پھیل چکا ہے۔ مواقع کی فراہمی اب کوئی بڑا مسئلہ نہیں رہ گیا ہے۔ پوری دنیا میں تہذیبی اور ثقافتی یونٹ منظم ہورہے ہیں جس سے دوستی کی راہ ہموار ہورہی ہے اور ان لوگوں سے تبادلہ خیال کے مواقع مل رہے ہیں جن سے ربط وملاقات کی عموماً کوئی صورت نہیں تھی۔ 9/11 سانحے کے بعد، دوسرے ممالک، ان کی تہذیب وثقافت، ان کے رہن سہن، بول چال، عادات واطوار کے متعلق زیادہ سے زیادہ جانکاری حاصل کرنے کا رواج اور سلسلہ چل نکلا ہے۔ پورے یوروپ اور امریکہ میں زور شور سے مشاعرے منعقد ہونے لگے ہیں۔ ایک دوسرے کے قریب آنے، سمجھنے بوجھنے، دنیا کو "عالمی گاؤں" بنانے کے سارے حربے استعمال ہورہے ہیں۔ ایسی حالت میں متفرق تہذیبوں کے انفرادی وجود کی راہیں مسدود ہورہی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ مادری زبان میں تعلیم کے صرف فوائد ہی ہیں اور نقصان کچھ بھی نہیں! لیکن ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ وہ نقصانات فریب نظر کا نتیجہ ہیں، مجازی ہیں اور اس کے لیے ذمہ دار کسی قوم یا ملک کا کم ترقی یافتہ ہونا ہے نہ کہ کوئی فرد اور اس کی ذات اور مادری زبان میں تعلیم تو قطعاً نہیں! اس کو تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عمومی طور پر تیسری دنیا اور خاص طور پر ہندستان جیسے ملک کا اعلیٰ تعلیمی نظام ترقی پذیر ہے نہ کہ ترقی یافتہ، امریکی یا یوروپائی نظام جیسا تو بالکل نہیں۔ ایسے حالات میں جب کوئی بچہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرکے اعلیٰ تعلیم کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اس کا سابقہ انگریزی سے پڑتا ہے کیونکہ اعلیٰ تعلیم کے اکثر وبیشتر ذرائع اور مواد خواہ وہ جغرافیہ ہو یا تاریخ، علم الحساب ہو یا علم طبیعات، علم کیمیا ہو یا علم سیاسیات، انگریزی میں ہی دستیاب ہیں۔ اگر ترجمے کی شکل میں کچھ منتقل ہوئی بھی ہے تو کئی لحاظ سے اس کے معیار اور استناد کا مسئلہ بہرحال لاحق رہتا ہی ہے۔ ایسے میں ان نووارد ین کو دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کی ساری محنت زبان سیکھنے میں ہی صرف ہوجاتی ہے اور موضوع ومواد سے واسطہ کم کم ہی رہ جاتا ہے۔ بہتر اور بڑے مواقع کی فراہمی کے عمل میں دنیا بھر سے

(بقیہ ص ۹ پر)

PDF Compressor Free Version

ہاجرہ خاتون

C/o Md. Irshad Ali, Near Nirmala College, Doranda, Ranchi 834002 (Mob. 9430254770)

ناصر کاظمی: کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

ناصر کاظمی (۱۹۷۲ء-۱۹۲۵ء) نے اپنی زندگی میں ترقی پسند ادبی تحریک کی نمو پذیری بھی دیکھی، اس کا عہد شباب بھی پرکھا اور اس تحریک کا زوال بھی ان کے سامنے ہی ہوا۔

ترقی پسند ادبی تحریک کا سارا زور وقت کے ساتھ اگرچہ نئی شاعری اور عہد شکن مارکسی فلسفے، رجائیت اور خطیبانہ تبلیغ بن کر کھوکھلا ثابت ہو چکا تھا اور تقسیم سے پہلے کی دنیا خواب کی دنیا بن چکی تھی، مگر اس کے باوجود حال کی تمام تر سنگلاخی بہر صورت موجود تھی، چنانچہ انسانی شعور کی بیداری کے لئے نئی آب و تاب کے ساتھ اردو غزل کی آبرو سنبھالنے نئے شعرا کی جو کھیپ ہمارے سامنے آئی، اس کے پیش رو اور امام کے بطور ہم ناصر کاظمی کا نام پیش کر سکتے ہیں۔

ناصر کاظمی کی شاعری کی باضابطہ ابتدا ۱۹۶۰ء سے ہو چکی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں جب ترقی پسند ادبی تحریک کی بھیڑ کانفرنس ہوئی تھی۔ اس وقت ترقی پسندی کے نام پر انتہا پسندی سے متنفر ہو کر بہت سے شعرا اور ناقدین ترقی پسندی سے علاحدہ ہو گئے۔

انہوں نے شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ ترقی پسند ادب اور شاعری موضوع اور پیش کش دونوں کے لحاظ سے یکسانیت کا شکار ہے، لہٰذا ترقی پسندوں سے قطع تعلق کرنے والے کھلے ذہن ترقی پسند ادبا شعرا کی ایک تازہ نسل تیار ہو گئی جس نے ترقی پسند پروپگنڈے سے قصداً گریز کیا۔ ان ہی میں شاعری کے حوالے سے ناصر کاظمی نمایاں اہمیت کے حامل ہیں جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان شعری افق پر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوئے۔

ناصر نے نظم کے بجائے غزل کے وسیلے سے اپنے تجربات کا اظہار کیا۔ غزل سے واقعی انہیں ایک طبعی مناسبت بھی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے غزل سے اپنی پسندیدگی کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

"میں نے زیادہ تر غزل کی شاعری پڑھی ہے، پھر یوں دیکھئے کہ اردو کا بہترین سرمایہ تو غزل ہی میں ہے۔"

ناصر کاظمی کے ساتھ ان کے معاصرین کے طور پر جو دو نام جدید شاعری کے منظر نامے پر بیک وقت ابھرے انہیں ہم خلیل الرحمٰن اعظمی اور ابن انشاء کے نام سے جانتے ہیں۔ ناصر کاظمی کا شعری مجموعہ "برگ نے" ابن انشاء کا "چاند نگر" اور خلیل الرحمٰن اعظمی کا "زندگی اے زندگی" ایسے مجموعے ہیں جن کا سرسری مطالعہ بھی یہ بتا دینے کے لئے کافی ہے کہ اس میں موضوع، ڈکشن اور پیش کش کا طریقہ ترقی پسند طرز سے قطعاً مختلف ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ترقی پسند شاعری نے خارجیت کو اور جدید شاعری نے داخلیت کو ترجیح دی اور ترقی پسند شاعروں نے جہاں اجتماعیت پر زور دیا، وہیں جدید شاعری نے انفرادیت پر۔ نمونہ کے طور پر مذکورہ تینوں شعرا کے ایک ایک شعر درج کرتی ہوں۔

کچھ یادگارِ شہر ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

(ناصر کاظمی)

کل چودھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرہ ترا

(ابن انشاء)

تیری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
میرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

(خلیل الرحمن اعظمی)

مذکورہ تینوں اشعار کے مقابلے میں کچھ اور اہم ترقی پسند شعرا کی فکر اور

PDF Compressor Free Version

اسلوب بھی ملاحظہ فرمائیں۔

میری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروحؔ
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

(مجروحؔ سلطان پوری)

بلیچے لاؤ کھولو زمین کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے

(کیفیؔ اعظمی)

اے وطن خاکِ وطن وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد

(علی سردار جعفری)

مذکورہ دونوں قبیل کے اشعار میں خارجیت اور داخلیت کے علاوہ انفرادی اور اجتماعی طرزِ اظہار کی کارفرمائی کو بہ خوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس کے منظرنامے کے طور پر جدید شاعری کی بنیاد پڑی۔ ناقدین نے متفقہ طور پر جدید شاعری کا امام ناصرؔ کاظمی کو ہی تسلیم کیا ہے۔ ناصرؔ کاظمی کی شاعری کو ان کی زندگی اور عہد کے حالات کے پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کی تخلیقیت اور جدیدیت کے بعض دلچسپ رموز آشکار ہوجائیں گے۔ ناصرؔ کے عشق کا ایک خاص پہلو جمالیاتی نوعیت کا ہے۔ یہ ان کی شخصیت کے حسن، دلکشی اور رنگینی کا منظرنامہ ہے۔ انتظار حسین کے ایک سوال کے جواب میں کہ وہ شاعری کی طرف کیسے چل پڑے؟ ناصرؔ کاظمی نے کہا تھا:

''میرے سارے ہی شغل ایسے تھے جن کا تعلق تخلیق سے اور فنونِ لطیفہ سے ہے۔ موسیقی، شاعری، شکار، شطرنج، پرندوں سے محبت۔ یہ سب جو ہے معلوم ہوتا ہے کہ میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔''

ناصرؔ کاظمی کی شخصیت اور اسلوب کی ایک قابل ذکر اور نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقیت اور اسلوب کی انفرادیت کے ساتھ لاجواب غزلیں کہیں۔

دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
جلا نہیں تو کیا ہوا، وہ شکل تو دکھا گیا

اُڑ گئے شاخوں سے یہ کہہ کر طیور
اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے

دل تو میرا اداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ہم ہی گلشن کے امین ہیں ناصرؔ
ہم سا کوئی نہیں بیگانۂ گل

جہاں ناصرؔ کاظمی نے لاجواب غزلیں کہیں، وہیں موصوف نے نثر بھی خوب خوب لکھی۔ ان کے شعری اور نثری سرمائے کی فہرست کچھ یوں ہے۔ ''برگِ نے'' ۱۹۵۲ء (غزلیں) ''دیوان'' ۱۹۷۲ء (غزلیں) ''پہلی بارش'' ۱۹۷۵ء (غزلیں) ''نشاطِ خواب'' ۱۹۷۷ء (نظمیں) ''سر کی چھایا'' ۱۹۸۱ء (منظوم ڈرامہ) ''خشک چشمے کے کنارے'' ۱۹۸۲ء (نثر) ''انتخاب میرؔ'' ۱۹۸۹ء، ''نظیرؔ'' ۱۹۹۰ء، ''ولیؔ'' ۱۹۹۱ء اور ''ناصرؔ کاظمی کی ڈائری'' ۱۹۹۵ء۔ مذکورہ تمام کتابیں ناصرؔ کی انفرادیت کی دلیلیں ہیں اور اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ غزل سے اولین شغف کے باوجود انہوں نے دیگر شعری و نثری اصناف سے بھی نمایاں دلچسپی رکھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی پہچان شاعری سے ہی بنتی ہے۔

میری نظروں میں ناصر کاظمی کا پہلا مجموعہ ''برگِ نے'' ان کی کافی اہم تصنیف ہے۔ ''برگِ نے'' سے گویا اردو میں جدید شاعری کی بنیاد پڑی۔ یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ جس طرح ترقی پسند ادب کی پشت پر اشتراکیت کا فلسفہ کام کر رہا تھا، اسی طرح جدیدیت نے اپنے لئے فلسفہ وجودیت کو آئیڈیل بنایا۔ اردو کی جدید شاعری نے جن عالمی وجودیت کے مفکرین کے اثرات بہت ہی واضح ڈھنگ سے قبول کئے، ان میں کافکا، کامیو اور سارتر وغیرہ نمایاں اور اہم ہیں۔

ترقی پسندوں نے سماجیات، خارجیت، عدم مساوات، استحصال کے مسئلے کو اپنی فکر کا غالب عنصر بنایا۔ اسی کے ردِعمل کے طور پر جدید شاعری نے تنہائی کا مسئلہ، ذاتی طرزِ اظہار، اپنے وجود پر اصرار اور وجود کے حوالے سے کائنات کو دیکھنے کی بنیاد ڈالی۔ انسان کی بے چہرگی، ضمیر کی موت، کسی بھی سماجی نظام کے کھوکھلے پن اور دوہرے معیار کے

PDF Compressor Free Version

خلاف جدید شاعری نے گویا مورچہ کھول دیا، جس کے نتیجے کے طور پر جدید شاعروں کے یہاں موضوع اور پیش کش دونوں اعتبار سے تبدیلیاں آئیں اور ان تبدیلیوں کے وقوع پذیر ہونے کا پہلا سہرا ناصر کی شاعری کے سر بندھتا ہے۔ داخلیت اور انفرادی طرز اظہار کی مثال ناصر کے ان اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے ۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

ان اشعار میں جو باتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں، ان کا تعلق ''کیا کہا گیا ہے'' کے ساتھ، ''کیسے کہا گیا ہے''، پر بھی منحصر ہے۔ ان میں محسوسات کو ناصر نے پیکریت عطا کی ہے اور اس میں اُسی قدر طاقت ور امیجری بھی ہے۔ یہاں ذہن شعر سے صرف تصویر ہی نہیں بناتا بلکہ پس منظر میں ایک لینڈ اسکیپ کو بھی ابھارتا ہے۔ احساسات کو متحرک تصویریت میں بدل دینے کا جو ہنر ناصر نے اپنی غزلوں میں برتا ہے، وہی دراصل ان کی غزلوں کا امتیاز ہے۔ ناصر کی کچھ نمائندہ اشعار ملاحظہ کریں ۔

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہیں

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے
خدا کرے کوئی تیرے سوا نہ پہچانے

وہ دل نواز ہے، لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں

کرم اے صرصر آلام دوراں
دلوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے

یاد ہے سیر چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

یہ عالم وحشت ہے تو کچھ ہو ہی رہے گا
منزل نہ سہی سر کسی دیوار سے مارو

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

ہم نے آباد کیا ملک سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے

مذکورہ اشعار میں فکر وفن کا جو رویہ شاعر نے اختیار کیا ہے، اس کی دھمک پہلی بار اردو شاعری میں سننے کو مل رہی ہے۔ میر کے لہجے کی بازدید، دل کو چھو لینے والا اسلوب، بات کہنے کے ڈھنگ میں درد وغم کی آمیزش، پیکریت اور لینڈ اسکیپ کے اعتبار سے رات، اندھیرا، خوف اور تنہائی وغیرہ کو شدت کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ناصر کے اشعار ہمارے دل کے باطنی تلاطم کو صرف بیدار ہی نہیں کرتے بلکہ ہمارے ذہن میں طغیانی بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ ناصر کاظمی کی غزلوں کی ایک اور خوبی بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ یہ کہ ان ناصر کے یہاں ہمیں اسلوب کی ایک نہیں بلکہ مختلف سطحیں ملتی ہیں۔ ناصر کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن سے ناصر کے اسلوب کی پختگی اور انفرادیت واضح طور پر جھلکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں ایسے اشعار بھی ہیں جو عصری احوال اور عصری حسیت کے اظہار میں کامیاب سہی، مگر ان کے اساسی وانفرادی اسلوب کے نمائندہ نہیں کہلا سکتے مثلاً ۔

کہیں آگ اور کہیں لاشوں کے انبار
بس اے دور زماں دیکھا نہ جائے

دن دہاڑے یہ لہو کی ہولی
خلق کو خوف خدا کا نہ رہا

(بقیہ ص ۶۳ پر)

PDF Compressor Free Version

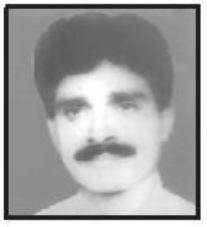

نوشاد احمد

Research Scholar, L.N.Mithila University, Darbhanga

طنز وظرافت کا رشتہ: اہمیت وافادیت

طنز وظرافت اردو ادب وشاعری کی ایک مشہور اصطلاح ہے، اسے علمی اور ادبی گفتگو میں عام طور پر، اگر چہ صرف اسلوب کا درجہ دیا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے صنف شاعری کا درجہ دینے کی گنجائش بھی موجود ہے اور اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ ''ہجو'' کو ہماری شاعری میں ایک صنف مانا گیا ہے اور ہجو بہر حال طنزیہ یا مزاحیہ انداز میں ہی ہوتی ہے، البتہ اس اعتبار سے طنز وظرافت کو محض اسلوب کہنے کی گنجائش یوں ضرور بنتی ہے کہ اس میں اصل قدر مشترک بہر صورت بیان کا ایک خاص رنگ ہی ہوتا ہے۔

طنز وظرافت کا فلسفہ کیا ہے؟ اس سوال کو سمجھنے کے لئے اس نکتہ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ جذبہ، فکر اور ارادہ زندگی کے تین اہم رخ ہیں جن سے حسن، حق اور خیر کا یا بصورت اضداد قبح، باطل اور شر کا رشتہ ہوتا ہے۔ ایک طنز نگار جب اپنے ماحول ومعاشرے میں کچھ غلط اقدار ومعیار اور نصب العین دیکھتا ہے تو وہ اس صورت حال پر بہ انداز ظرافت تنقید کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور اس کا یہی انداز، ایک خاص اسلوب کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

''طنز'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ناز، تجربہ اور رمز کی بات کہنے کے ہیں جو بصورت طعن ہو۔ اصطلاحی اعتبار سے ''طنز'' کو انگریز کے لفظ "Satir" کا ہم مفہوم قرار دیا گیا ہے۔ ''انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا'' میں لکھا ہے کہ:

> ''ہجو وہجا کا مقصد یہ ہے کہ کسی مضحکہ خیز واقعہ یا حالت پر ہمارے جذبہ تفریح یا نفرت کو تحریک ملے اور اس ہجو و طنز میں ظرافت یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں بھی ہو اور ادبی حیثیت کا حامل بھی۔''

طنز کے بارے میں متعدد مغربی مفکرین نے جو کچھ لکھا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ''طنز'' دراصل ذہن اور دماغ کو آلائشات سے پاک کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے اور اس میں غلطیوں، جہالتوں اور ان سے مرتب ہونے والے عوارض کو لعن وطعن کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ طنز نگار کا منصب یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے پر حتی المقدور ناقدانہ نظر ڈالتا ہے اور مکر وفریب، رعونت، منافقت اور ظلم وستم کے خلاف اس طرح قلمی جہاد کرتا ہے کہ اس سے ہمارے جذبات محبت ونفرت اور حقارت ومرحمت کو تحریک ملتی ہے، یہاں تک کہ ہم مظلوموں کے لئے شفقت محسوس کرتے اور ظالموں کو قابل ملامت تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے طنز کو ''عزت ریزی اور خوشامدانہ تعریف کے بین بین'' کہا ہے اور رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب ''طنزیات و مضحکات'' میں لکھا ہے کہ طنز ''ذاتی عناد وتعصب سے پاک اور ذہن وفکر کی بے لوث برہمی اور شگفتگی کا نتیجہ'' ہوتا ہے، بالفاظ دیگر فرد یا جماعت کی کمزوریوں پر نکتہ چینی کرنے اور اسے عام لوگوں کے سامنے مضحکہ خیز انداز میں پیش کرنے کا نام طنز ہے۔

عام طور پر طنز وظرافت کی اصطلاح ایک ساتھ استعمال ہوتی ہے، لیکن دراصل ان دونوں میں بڑا ہی لطیف فرق ہے۔ ''ظرافت'' کا لفظ عربی زبان سے آیا ہے اور اس کے معنی عقلمند اور ہوشیار ہونے کے ہیں، چنانچہ عربی میں عقلمند کو ''ظریف'' کہا جاتا ہے اور اہمیت وضرورت لحاظ سے بقول عبادت بریلوی:

> ''کلام میں ظرافت کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو نصیب ہے۔''

طنز اور ظرافت میں ایک کھلا فرق یہ ہے کہ طنز کا مقصد تنقید واصلاح ہے

PDF Compressor Free Version

جب کہ ظرافت کی غرض محض تفریح ومزاح ہوا کرتی ہے۔ بقول برگساں:

''مزاح کی اپیل براہ راست ذہانت سے ہوتی ہے۔''

فرائڈ نے لکھا ہے کہ بے ضرر وافادی لطائف اور مضحک اور خالص مزاح، ظرافت کے اہم خصائص ہیں۔ مزاح دراصل زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا اظہار بقول اسٹیفن لی ،فنکارانہ طریقے سے ہوجائے۔ یہاں برناڈ شا کا یہ قول بھی یاد آتا ہے کہ:

''میری ظرافت سچ بات کہنے میں ہے اور دنیا میں سچ ہی عمدہ مزاح ہے۔''

شاید اسی اعتبار سے محض ظرافت کو ''کھوکھلا مزاح'' اور اس کے مقابلے میں مقصدی طنز کو ظرافت کی اعلیٰ قسم کہا گیا ہے۔ ظرافت بلاشبہ زندگی اور زندہ دلی کا نام ہے اور دائرۂ اخلاق میں رہتے ہوئے حاضر جوابی دکھانا ہی اصل ظرافت اور بذلہ سنجی ہے۔ کلیم الدین احمد نے "Homour" کا ترجمہ ظرافت کیا ہے اور بتایا ہے کہ:

''ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی چیز کو دکھا کر ہنستا تو ہے، مگر اس نقص یا خامی اور بدصورتی کو دور کرنے کا خواہش مند نہیں ہوتا۔''

رشید احمد صدیقی نے اس تعلق سے بڑی اچھی مثال دی ہے کہ:

''جب تاش کی بازی میں ملکہ، بادشاہ، بیگم سبھی کٹ جاتے ہیں تو اس حال میں جس طرح جوکر کو اپنا فرض ادا کرنا پڑتا ہے اسی طرح مزاح نگار کو بھی سماجی امور پر قلم فرسائی کرنی پڑتی ہے۔''

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ طنز وظرافت دونوں ہی کا اپنا اپنا مقام ہے اور ان دونوں کا محرک زندگی کا وہ بے تکا پن ہوتا ہے جو فرد یا سماج میں راہ پا گیا ہو۔ اسلوب طنزیہ بھی ہوتا ہے اور مزاحیہ بھی، مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ کسی فنکار کا اسلوب اس وقت تک محض ظریفانہ اور مزاحیہ ہی کہلانے کا حقدار ہوگا جب تک وہ زندگی کے بے تکے پن سے صرف لطف اندوز ہوتا رہے، البتہ اس سے آگے بڑھ کر جب وہ اس پر برہم بھی ہوگا اور خاص جذبہ جمالیات، موزونیت اور جوش وانصاف کے ساتھ اسے دور کرنے کے لئے کوشاں بھی تب ہی اس کا اسلوب ''طنزیہ'' کہلا سکے گا۔

اس فرق کو علی عباس حسینی نے یوں بتایا ظرافت تو محض جلد کو چھو کر گزر جاتی ہے جب کہ طنز ایک نشتر ہوتا ہے جس سے زخم کا منھ کھولا جاتا ہے اور اسے مشاقی کے ساتھ ٹانکا دے کر سی دیا جاتا ہے۔

جہاں تک طنز وظرافت کی تکنیک اور اس کے فن کار کی ذمہ داریوں کا تعلق ہے، ماہرین نے بتایا ہے کہ اس کے انداز میں ادبیت اور اسلوب میں انوکھا پن ہونا چاہئے۔ تمثیل کے پیرائے میں طنز نسبتاً زیادہ بہتر ہوتا ہے، طنز نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں ہمدردی کا جذبہ ہو اور وہ مزاح نگاری سے بیگانہ نہ ہو۔ جس طرح ایک کارٹونسٹ کسی چھوٹی چیز کو غیر معمولی طور پر بڑی اور بڑی چیز کو غیر معمولی طور پر چھوٹی کر کے دکھاتا ہے اسی طرح مزاح نگار زندگی اور سماج کی ناہمواریوں کو اپنے خاص انداز سے یوں سامنے لاتا ہے کہ ہم اس کی طرف توجہ دئے بغیر بھی نہیں رہ پاتے اور جب توجہ دیتے ہیں تو اس سے محظوظ ہوئے بغیر اور خاص ذہن لئے بغیر بھی نہیں رہ پاتے۔

طنز ایک نفسیاتی حربہ ہوتا ہے اور اس کی اہمیت جہاں اس کی مقصدیت سے اعتبار پاتی ہے وہیں ظرافت کی بدولت اسے اچھا اور پرلطف پیرایہ بیان مل جاتا ہے۔ کسی نے ایک مثال دی تھی کہ مزاح نگار ہرن کے ساتھ بھاگتا ہے اور طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔ اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان کو نفسیاتی طور پر شدید سے شدید ضرب اتنی اذیت نہیں دیتی جتنی یہ بات کہ کوئی اس پر ہنسے اور طنز وظرافت کا فن کار دراصل اسی نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

کامیاب طنز ومزاح یہ ہے کہ وہ دوسروں کے اندر آواز بازگشت پیدا کردے اور اس کے لئے زبان پر قدرت لازمی ہے۔ ہنسی کے لئے تضاد وتقابل بہت اہم ہے اور یہی وجہ ہے کہ مزاح نگاری میں موازنہ سے اکثر وبیشتر بڑے بڑے کام لئے جاتے ہیں۔ اردو میں پطرس بخاری کے ''کتے'' اس کی اعلیٰ مثال ہے جس میں مشابہت اور تضاد سے مزاح کو تحریک دی گئی ہے۔ اسی طرح مزاحیہ صورت واقعہ بھی اس فن میں بڑا مددگار ہے۔

جہاں تک مزاحیہ کرداروں کی بات ہے، سرشار کا ''خوجی''

(بقیہ ص ۹ پر)

PDF Compressor Free Version

نشاط اختر

Research Scholar, Patna University, Patna 800004 (Mob. 9006503843)

تمنا مظفر پوری کی ڈرامہ نگاری کے چند پہلو

ڈرامہ ادب کی ایک مشہور اور قدیم صنف ہے۔ اردو میں ڈرامہ نگاری کی روایت کی تشکیل کا عمل ۱۸۵۳ء سے شروع ہوا۔ ''راجہ گوپی چند اور جالندھر'' پہلا ڈرامہ ہے جسے بمبئی میں اسٹیج کیا گیا اس سے اکیس سال بعد بہار میں ڈرامہ کی تشکیل کا باضابطہ عمل ۱۸۷۴ء میں اس وقت شروع ہوا جب پٹنہ میں ایک تھیٹر قائم کیا گیا اور اس سے بہار کے پہلے ڈرامہ نگار کیشورام بھٹ کے دو ڈرامے ''سجاد سنبل'' اور ''شمشاد سوسن'' اسٹیج کیے گئے اور پھر کیشورام بھٹ اور سید محمد نواب سے لے کر سہیل عظیم آباد تک متعدد قلم کاروں کے ذریعہ بہار میں ڈرامہ نگاری کے میدان میں مسلسل کاوشیں ہوتی رہیں اور کئی کامیاب ڈرامے لکھے گئے۔ آزادی کے بعد بھی اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے کئی ادیبوں نے مختلف صنفوں کے ساتھ اس پر بھی طبع آزمائی کی اور کم وبیش کامیاب رہے۔

صوبہ بہار کے چند ممتاز ڈرامہ نگاروں میں اختر اورینوی، اشرف قادری، سید محمد حسنین، شفیع مشہدی، عظیم اقبال اور ظفر عدیم جیسے فنکاروں کے نام شامل ہیں اور اسی فہرست میں تمنا مظفر پوری نے بھی نمایاں جگہ پائی ہے۔ انہیں گرچہ طنز وظرافت اور انشائیہ نگاری کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے، مگر سچ یہ ہے کہ بہار میں ڈرامہ نگاری کی ارتقائی تاریخ بھی انہیں بہر صورت بھلا نہیں سکتی۔

تمنا مظفر پوری کی ڈرامہ نگاری کے ایک نہیں ایک قابل ذکر پہلو ہیں جسے ان کے ڈراموں کے مجموعہ ''پردے کے سامنے'' کے مطالعہ سے آسانی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے اور اس وقت یہی میرا موضوع ہے۔ تمنا مظفر پوری کے اس مجموعے میں نو ڈرامے شامل ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں اشاعت یافتہ اس مجموعے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے موضوعات متوسط طبقے کی زندگی کے معاملات ومسائل سے اخذ کیے ہیں۔ موجودہ دور میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو حصول روزگار کے دوران جن مشکلات اور آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے یا بچیوں کی شادی کے سلسلے میں جہیز کی لعنت کی وجہ سے جو المناکیوں رونما ہوتی ہیں اور کمزور اعصابی فضا نے افواہ پسندی کے جس میلان کو تقویت پہنچائی ہے، ان تمام نکتوں کی صراحت ان ڈراموں میں موجود ہے۔

تمنا مظفر پوری کا ڈرامہ ''مجھے انصاف چاہئے'' ایک ایکٹ کا ڈرامہ ہے اور اس میں دو مناظر، عدالت کے ہیں اور عدالت ہی میں ڈرامہ مکمل ہوجاتا ہے۔ اس ڈرامے کے توسط سے مصنف نے نہایت ہی عمدہ اور سہل ڈھنگ سے رمیش جیسے نوجوان کو مرکزی کردار بنا کر پیش کیا ہے، جس نے اپنی عقلمندی سے سماج کے ایک ایسے طبقے کے اصلی چہرے کو سامنے لایا ہے جو سماج کا ٹھیکیدار کہلاتا ہے۔

''بیگم کا گھریلو بجٹ'' طرز پیش کش کے لحاظ سے مزاحیہ، لیکن موضوع کے اعتبار سے بہت سنجیدہ کاوش ہے۔ اس ڈرامہ میں ایک متوسط طبقے کے گھریلو اخراجات اور ان کی محدود آمدنی کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ ریڈیائی ڈرامہ ۱۹۸۵ء میں لکھا گیا تھا جو نہ صرف نشر ہوا بلکہ کئی بار اسٹیج بھی کیا جاچکا ہے۔

''قصہ کراسن تیل کا'' اگرچہ مختصر ایکٹ کا ڈرامہ ہے، مگر اس میں سماج میں افواہ پھیلانے والے اور بے جا طریقے سے کسی کو پریشان کرنے والے طبقے کو بڑی ہنرمندی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ''مجھے پھانسی دے دیں'' بھی ایک خالص جذباتی نوعیت کا ڈرامہ ہے جو بہر حال پڑھنے والوں کو متاثر کرتا ہے۔

ڈرامہ ''انٹرویو بورڈ'' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ آج کے زمانے میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو حصول روزگار کے لئے کیسی کیسی مشکلات اور

PDF Compressor Free Version

آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انٹرویو بورڈ میں پس پردہ کیا کچھ نہیں ہوتا ہے یہ بجائے خود ایک بڑا المیہ ہے اور اسے ڈراما نگار نے اپنی فنی بصیرت اور چابک دستی کے ساتھ بخوبی سامنے لایا ہے۔

تمنا مظفر پوری کی کاوش ''گرام پنچایت'' کو ایک طرح سے ڈرامہ نگاری کے میدان میں اگرچہ تجربہ کے مصداق کہا جاسکتا ہے، مگر ان کا یہ تجربہ ہمیں متوجہ کرلیتا ہے۔ اس ڈرامے میں تمنا مظفر پوری نے صرف چار کردار لئے ہیں اور چاروں جانے پہچانے اور مشہور و معروف ہیں۔ دو کردار پریم چند کے مشہور افسانے ''پنچ پرمیشور'' سے لئے گئے ہیں۔ الگو چودھری اور جمن۔ تیسرا کردار خود منشی پریم چند اور چوتھا زکی انور کے ڈراموں کی برج بانو (یعنی اردو) ہے۔ اس میں پریم چند کی تحریروں کے اقتباسات ان کے مکالمے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ پورا ڈرامہ پریم چند کے دور کے سیاسی و سماجی حالات اور نظریات کے بالمقابل آج کے حالات کو دکھاتا ہے اور موجودہ عہد پر ایک طنز کرتا ہے۔ تمنا مظفر پوری ایک حساس فن کار ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مختلف موضوع پر ڈرامے لکھا ہے۔ جہیز کی لعنتیں ان کے سامنے تھیں۔ چنانچہ ان کے مجموعے میں ایک ایسا مزاحیہ ڈراما بھی ملتا ہے جس میں جہیز کی لعنت کے پس منظر میں ریل گاڑی کے سفر کے توسط سے خوبصورت لطیفہ کا انداز اپنایا گیا اور میں حقیقت سامنے لائی گئی ہے۔

تمنا کا ڈرامہ ''رحم و ستم'' شیکسپیئر کے شہرہ آفاق ڈرامے ''مارچنٹ آف وینس'' کے اس حصے کی اردو شکل ہے جو ''ٹرائل آف انٹونیو'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا اسلوب بہت سیدھا سادہ ہے اور جگہ جگہ اشعار کے برجستہ استعمال اور مکالموں کا روایتی لب و لہجہ بسا اوقات آغا حشر کاشمیری کی یاد دلاتا ہے۔ یہ ڈرامہ ۱۹۶۳ء میں ماہنامہ ''کلیاں'' میں چھپا تھا۔

اسی طرح ''مچھلیوں کی عدالت'' بھی اپنے طرز کی ایک البیلی تمثیل ہے۔ اس میں مختلف کرداروں کو مچھلیوں کا نام دے کر ایک عدالتی مقدمہ کی شکل دی گئی ہے۔ اس کی خوبی سے لطف اندوز ہونے کے لئے مچھلیوں کی مختلف صفتوں اور خصوصیات سے واقفیت ضروری ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمنا مظفر پوری بنیادی طور پر طنز و مزاح کے فن کار ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک حساس فن کار کی طرح انہوں نے اپنے عہد کی ناانصافیوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس لئے جہاں ایک طرف ان کے ڈراموں میں برتے گئے موضوعات عصری حیثیت اور اصلاحی مقصدیت سے آراستہ دکھائی دیتے ہیں اور بہرحال اپنے اردگرد کی دنیا اور اپنے گھر، ماحول اور معاشرے میں ایک سدھار لانے والی ذہنیت دینا چاہتے ہیں، وہیں دوسری طرف انہوں نے بہرصورت ڈرامے کی تکنیک اور اس کے فن پر بھی مناسب نظر رکھی ہے۔ ان کا بنیادی فن طنز و ظرافت ہے اور اس کی جھلکیاں بہرکیف ان کے سبھی ڈراموں میں مل جاتی ہیں۔ انہوں نے جو مناظر پیش کئے ہیں چاہے وہ عدالت کے مناظر ہوں یا پھر کسی متوسط گھر کا سین، بہرحال ان میں ایک قسم کی شفافیت اور برجستگی ملتی ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مناسب آہنگ کے ساتھ ڈرامے میں مکالموں کو جگہ دی ہے، جو اپنا ایک مخصوص اثر رکھتے ہیں۔ کرداروں کی پرت کھولنے اور ماحول کی جہتیں دکھانے میں بھی تمنا مظفر پوری بحیثیت ڈرامہ نگار پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

ڈرامے کے لئے تجسس اور تصادم کے عناصر فنی اعتبار سے اپنی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے اگرچہ تکنیکی طور پر تمنا مظفر پوری تجسس کے عناصر کی حفاظت میں ہر جگہ یکساں کامیاب نہیں ہیں، لیکن جہاں تک تصادم خصوصاً اقدار و نظریات اور نفسیات کے تصادم کی بات ہے، اسے انہوں نے ہنستے کھیلتے اپنے مخصوص انداز میں بہت عمدگی سے برتا ہے۔ ان کے ڈراموں کا مطالعہ کرتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ شکست و ریخت کا منظرنامہ پھیل رہا ہے اور روبہ کمال دکھائی دینے والی قدریں درحقیقت روبہ زوال ہو رہی ہیں۔ انصاف تمنا مظفر پوری کے نزدیک بڑی چیز ہے اور ان کے ڈراموں میں تصادم کا عنصر بہرحال اس کی برتری سامنے لا دیتا ہے۔ یہ کہنا تو ذرا مشکل ہے کہ تکنیکی باریکیوں کے لحاظ سے تمنا مظفر پوری کے ڈرامے آخری حد تک کامیاب ہیں، لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کی یہ کاوشیں ادبی اور ریڈیائی ڈراموں کے تقاضوں کو بڑی حد تک پورا کرنے کے ساتھ ساتھ بہت ساری ایسی خوبیوں سے بھی آراستہ ہیں جو ڈرامے کی پیش کاری

PDF Compressor Free Version

کے لئے لازمی ہوتی ہیں اور اپنے فنکار کی عظمتوں کا احساس دلاتی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تمنا کا ڈرامہ اسٹیج کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کردیتا ہے۔ یہاں ڈرامہ نگار نے جیسا کہ ایک نظر میں محسوس ہوتا ہے وحدت ثلاثہ پر نگاہ رکھی ہے اور کوئی ایسا منظر نہیں لایا ہے جو وقت، مقام اور تاثر کو دولخت کردے۔

ایک اور بات جو نظر سے گزرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے جن کے لئے یہ ڈرامے لکھے ہیں ان کی نفسیات اور ان کے مزاج کو بھی پوری طرح سامنے رکھا ہے۔ خصوصاً بچوں کے لئے انہوں نے جو کوشش کی ہے وہ بہر حال ایک بڑی کمی کو دور کردینے کے مصداق ہے۔

تمنا مظفر پوری کے ڈراموں میں جہاں تک لفظیات کا تعلق ہے وہ ماحول سے ہم آہنگ ہیں مثلاً اگر عدالت ہے تو عدالتی الفاظ کام میں لائے گئے ہیں۔ ڈرامے اور تمثیل میں فنی طور پر ایک قربت بھی ہے اور کچھ خاص فرق بھی اور ''مچھلیوں کی عدالت'' میں ان پہلوؤں کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے جو کوشش کی ہے وہ یقیناً معمولی نہیں۔

مچھلی تو مچھلی ہے، لیکن مچھلی کے مختلف انداز سے انہوں نے ڈرامے میں مکالمے کی فضا کو جس طرح استوار کیا ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ واقعی تمنا مظفر پوری کی ڈرامہ نگاری دراصل ان حقائق کو تکنیکی روایت اور فن سے واقفیت کے ساتھ سامنے لانے میں کامیاب ہے جو عموماً پردے کے پیچھے چھپی ہوتی ہے۔ اپنے ڈراموں کو زیادہ سے زیادہ پر اثر اور دلچسپ بنانے کے لئے انہوں نے طنز و مزاح کی جو ڈگر اپنائی ہے وہ بھی ان کی فکری و فنی ہوشمندی کا ثبوت ہے۔ ❁❁

ماوری زبان میں تعلیم.....(ص ۱۱ سے آگے)

واسطہ پڑنا لازمی ہے۔ ایسے حالات میں دوسری زبانوں اور خاص طور پر انگریزی سے دوری کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کا احساس شدت عروج تب حاصل کرلیتا ہے جب زبان کی مجبوریوں کے بنا پر کوئی بڑا موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ عالم کاری کے اس دور میں کنویں کا مینڈک بنے رہنا ممکن ہی نہیں بلکہ خودکشی کے مترادف بھی ہے۔ مختلف ممالک کے لوگوں سے ملاقات، تبادلہ خیال، ترسیل، ان کا ادب، ان کی تاریخ یا ازیں قبیل دوسرے تمام تر اہم امور کے مدنظر، تمام تر زبانیں سیکھنا ممکن تو نہیں اور اس کا مطالبہ احمقانہ بھی ہوگا، لیکن انگریزی جو کہ ایک بین الاقوامی زبان (Lingua Franca) بن کر ابھری ہے، اس کی حد تک رسائی اس دور میں تقریباً لازمی ہوگئی ہے۔ ایسے میں ابتدائی ادوار میں ماوری زبان اور انگریزی کا مرکب اور مخلوط علم کیا ہی خوب اور کارگر جواز پیش کرتا ہے۔

کثیر لسانی اور کثیر تہذیبی سماجوں میں اپنی شناخت، اپنی تہذیب و تمدن اور وجود کو قائم رکھ پانے کا واحد ذریعہ اپنی زبان کی تعلیم اور ترویج و اشاعت ہے۔ خود تہذیبی شناخت سے اطمینان حاصل کرنے کے لئے واحد معاون زبان ہی ہے۔ یقین مانیے ماوری زبان ہی پھلنے پھولنے، ترقی حاصل کرنے، شناخت، انفرادیت، آبا و اجداد کی کمائی گئی پونجی اور وراثت کے تحفظ کی ضامن اور روحانی سکون کا وسیلہ ہے۔

❁❁❁

طنز و ظرافت کا رشتہ: اہمیت و افادیت (ص ۱۶ سے آگے)

اور تاج کے ''چچا چھکن'' ہم سبھوں کو یاد ہیں۔ زبان و بیان کی بازیگری اور خصوصاً تحریف یا پیروڈی بھی اس فن کا اہم عنصر ہے اور اس معاملے میں کنہیالال کپور بہر حال بھلائے نہیں جاسکتے۔

اردو میں طنز و مزاح کی تکنیک کے نوع بہ نوع خوبصورت جلوے بکھرے پڑے ہیں۔ نظیر کی شاعری، پنچ کی صحافت اور میر و غالب کے کلام میں اس فن کی تجلیاں الگ الگ انداز سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ طنز و ظرافت نگاری کا سلسلہ نہ صرف کلاسیکل فن کاروں کے یہاں ملتا ہے، بلکہ جدید دور میں بھی ہمارے فن کاروں نے اس روایت کو بخوبی آگے بڑھایا ہے اور ہمارے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ جہاں ملک اور بیرون ملک کے لکھنے والوں نے اس میدان میں شہرت پائی ہے وہیں انجم مانپوری سے لے کر رضا نقوی واہی تک خود ہمارے بہار میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک فن کاروں کی ایسی تحریریں موجود ہیں جنہیں بلا تامل اردو طنز و ظرافت کی تاریخ کا اٹوٹ حصہ کہا جاسکتا ہے۔ ❁❁

فرحت بانو

Research Scholar, Deptt. of Urdu, L.N.Mithila University, Darbhanga

قومی یکجہتی کے علمبردار: سرسید احمد خاں

سرسید احمد خاں کی عظیم شخصیت اور ان کے مایہ ناز کارنامے ہندوستان کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی عوام کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں اور ان کے علم و ہنر سے آگاہ کرنے اور جدید علوم و فنون کی عصری ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اسے رائج کرنے کی خاطر خواہ سعی کی۔

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اگرچہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی انگریزوں کے متواتر اور بے پناہ ظلم و ستم کے شکار ہوئے، مگر انگریزوں کی اس جارحانہ پالیسیوں اور فرقہ وارانہ شرپسندی کی وجہ سے مسلمانوں کو نسبتاً زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ مسلمانوں کی تہذیبی و ثقافتی میراث اور معاشرتی زندگی کو غیر معمولی طور پر زک پہنچانے کی متواتر کوشش کی گئی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے سرسید احمد نے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت محسوس کی وہ تھی، مسلمانوں کی تعلیم۔ انہوں نے سوچا کہ جب تک مسلمان جدید علوم و فنون کی دولت سے سرفراز نہیں ہوں گے ان کا وقار اور ان کا رتبہ بلند نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ملکی اور صوبائی سطح پر جگہ جگہ جلسوں کا انعقاد کیا اور مسلم قوم کو بیدار کرنے کی مہم تیز سے تیز تر کرتے گئے، جس سے مسلمانوں کے اندر احساس بیداری ہوا، ان کے خیالات و افکار میں تحریک پیدا ہوئی اور ان کے اندر اپنے معیار زندگی کو سنوارنے کا جذبہ ابھر کر سامنے آیا۔ سرسید احمد خاں کی تقریر اور تحریک کے دوررس نتائج سے حسب حالات مسلم قوم کے اندر تعلیم کا شعور جاگا۔ سرسید احمد کی آرزو پوری ہوتی ہوئی نظر آئی۔ انہوں نے ایک جلسہ میں پرجوش انداز میں تعلیم کے متعلق فرمایا تھا:

> ”بے علمی مفلسی کی ماں ہے، جس قوم میں علم و ہنر نہیں رہتا وہاں مفلسی آتی ہے اور جب مفلسی آتی ہے تو ہزاروں جرموں کے سرزد ہونے کی باعث ہوتی ہے۔ اب تم اپنی قوم کے حال پر ہی غور کرو کہ یہ بدبخت دن ان پر آ گئے ہیں۔ بڑے بڑے قدیمی خاندان سب گر پڑے ہیں۔ تمام قوم پر مفلسی اور محتاجی اور قرضہ داری اور ذلت چھا گئی ہے، تمام قوموں نے اور بڑے بڑے دانشوروں نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ قومی ترقی، قومی تعلیم و تربیت پر منحصر ہے۔ پس اگر ہم اپنی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں تو قومی تعلیم اور قوم کو علم و ہنر سکھانے کی کوشش کریں۔“ (متن تقریر بحوالہ، نیا دور، لکھنؤ اکتوبر ۲۰۱۲ء، ص ۳۳ و ص ۳۴)

بہرکیف مسلمانوں کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے سرسید نے جو تحریک چلائی وہ کامیاب ہوئی اور یہی تحریک آگے چل کر ”علی گڑھ تحریک“ کے نام سے مشہور و معروف ہوئی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کی سماجی زندگی کو سنوارنے اور ان کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔ اس تحریک کی وجہ سے مسلم قوم اپنی شناخت قائم رکھنے میں کامیاب ہوئی۔

اس تعلیمی اور اصلاحی تحریک میں سرسید نے غیر مسلموں کی سرکردہ شخصیات کی خدمات بھی حاصل کیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے بغیر یہ جدوجہد ادھوری رہے گی۔ غیر مسلموں نے بھی اس تحریک میں خاطر خواہ نمائندگی دی، جس کی وجہ سے آپسی بھائی چارگی، فرقہ وارانہ میل محبت اور مذہبی و قومی اخلاص بھی مستحکم ہوا۔ ان کے ذریعہ قائم تعلیمی اداروں میں بلاتفریق مذہب و ملت ہندو، مسلم اور سکھ سب اعلیٰ تعلیم سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ انہوں نے ۱۸۸۴ء میں لاہور کے ایک بڑے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

PDF Compressor Free Version

"مجھے افسوس ہوگا کہ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ کالج ہندو مسلمان کے درمیان تفریق پیدا کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے، اس کا مقصد مسلمانوں کی جہالت کو دور کرنا تھا۔ ان کے مذہبی کٹرپن نے ان کو اس تعلیم سے محروم کر دیا تھا، جو سرکاری اسکولوں میں عام تھی، اس لئے ان کی تعلیم کے لیے یہ خصوصی انتظام کیا گیا..... مجھے خوشی ہے کہ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کالج کے دونوں فرقوں کا بڑا حق ہے اور یہاں کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔ ہندو اور مسلمانوں کو میں اپنی دو آنکھیں خیال کرتا ہوں۔"

(متن تقریر بحوالہ ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ، اکتوبر ۲۰۱۳، ص ۳۳ و ص ۳۴)

سرسید احمد خاں قدیم تعلیمی روایات خصوصیت سے مسلمانوں کی قدیم تعلیمی روایات سے خوش نہیں تھے۔ وہ اسے موجودہ دور کی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے جدید علوم کی طرف خاص توجہ دی۔ انہیں یقین تھا کہ اگر لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو ان کی سماجی، معاشی اور سیاسی خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ حکومت بھی ان کی مانگوں کو اور ان کے حقوق کو نظر انداز نہیں کر سکے گی، یہی وجہ ہے کہ پہلی جنگ آزادی کے فوراً بعد ان کے اندر تعلیمی دلچسپی شروع ہوگئی، جس نے رفتہ رفتہ باقاعدہ تعلیمی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ سرسید احمد خاں کی پہلی کوشش ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالنا ہے۔ اس کے بعد غازی پور میں "سائنٹیفک سوسائٹی" قائم کرنا ہے۔ ان کے ہندو مسلم اتحاد کا ثبوت یہ ہے کہ اس سوسائٹی کا سنگ بنیاد راجہ دیو نارائن سنگھ اور مولانا محمد فصیح نے مل کر رکھا۔ ۱۸۶۴ء میں جب سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا تو اس سوسائٹی کو وہ علی گڑھ لے آئے۔ ۱۸۶۶ء میں اس سوسائٹی کی جانب سے ایک اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کا اجرا کیا جو شروع میں ہفتہ وار اور بعد میں سہ روزہ ہوگیا۔

سرسید احمد اپنے عہد کے ایک ایسے نبض شناس تھے، جن کی گہری نظر اس وقت کے پر آشوب دور پر تھی۔ ان کے اندر حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ہندوستان کے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات کو سدھارنا چاہتے تھے، لیکن ایک طرف وہ انگریزی حکومت میں ملازم تھے اور دوسری طرف ہندوستان کا ایک بڑا طبقہ انگریزوں کے خلاف کھل کر سامنے آنے کو تیار نہ تھا۔ انہوں نے اپنے حکیمانہ فکری بصیرت سے کام لے کر ہندوستانی قوم میں جو احساس کمتری کی شکار تھی، حب الوطنی کا جذبہ جگا کر اور قومی یکجہتی کو قائم رکھ کر ذہنی طور پر انہیں نئے حالات کا کامیاب مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا۔ سرسید نے انگریزوں سے بھی جو قریبی روابط پیدا کئے، اس میں قومی مفاد پوشیدہ تھا۔

سرسید احمد خاں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ملک کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ بڑے بڑے لوگوں سے، جن میں اہل علم کا طبقہ بھی شامل تھا، ملاقاتیں کیں اور انہیں انگریزوں کی سازشوں سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں اکثر یہی کہا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی ہوا میں سانس لیتے ہیں، ایک ہی جگہ کا پانی پیتے ہیں اور ایک جگہ کا کھانا کھاتے ہیں اور ایک ہی جگہ یعنی ہندوستان میں جیتے اور مرتے ہیں، پھر ایک دوسرے کے درمیان نفرت اور دوریاں کیوں۔ ان کی ان باتوں سے ہندوستان کا پڑھا لکھا، دانشور طبقہ ان کے ساتھ ہوگیا اور انگریزوں کی سازشوں کو ناکام کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔

سرسید احمد اپنے ملک وقوم کی بھلائی اور ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ کچھ لوگ ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے صرف مسلمانوں کے لیے کام کیا حالانکہ یہ بات کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے خود ایک جگہ فرمایا ہے:

"ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب وہوا کے شریک ہیں۔ ایک دریا یا کنوئیں کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج وراحت میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملے بغیر چارہ نہیں۔ پس ان دونوں کو الگ الگ رکھنا دونوں کو برباد کر دینا ہے۔ ہم کو ایک دل ہو کر مجموعی حالت میں کوشش

(بقیہ ص ۳۰ پر)

PDF Compressor Free Version

محمد امان اللہ

Research Scholar, L.N.Mithila University, Darbhanga

غالبؔ کے جدید دور کے نقاد

مرزا غالبؔ ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ اس اعتبار سے ایک خوش نصیب شاعر کہلانے کا حق بھی رکھتے ہیں کہ انہیں ہمیشہ سے ہی بلند پایہ ناقدین کی توجہ حاصل رہی۔ غالبؔ کی شاعری کو تنقیدی نظر سے دیکھنے والوں نے اسے دو واضح ادوار میں رکھا ہے۔

اس تقسیم کی رُو سے ظاہر ہے کہ مرزا غالبؔ کے پہلے دور کی وہ شاعری جس پر بیدلؔ کے انداز فکر و آہنگ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، قدما کے نزدیک بے وقعت ٹھہرتی ہے اور اس جہت سے غالبؔ مہمل گو شاعر قرار پاتے ہیں۔ ''مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے'' والی آغا جان عیشؔ کی بات اسی دور کی یاد دلاتی ہے، جب کہ دوسرے دور کے تعلق سے ناقدین فن نے بہر حال غالبؔ کی گونا گوں عظمتوں کا مسلسل اور صریح اعتراف کیا ہے۔

غالبؔ کے معتقدین اور مقلدین کے ایسے خیالات سے قطع نظر جو ان کے کلام کو سرتاسر الہامی بتاتے ہیں، جہاں تک غالبؔ کے ناقدین کی بات ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی باقاعدہ تحریروں کا سلسلہ حالیؔ سے شروع ہوتا ہے۔ حالیؔ نے غالبؔ کا مرثیہ لکھا ہو یا ''یادگار غالبؔ'' جیسی کتاب، بہر حال اس کی اہمیت طے شدہ ہے۔ حالیؔ کے بعد کلام غالبؔ کے مطالعہ کا سلسلہ رومانی تنقید کے زیر اثر آگے بڑھا اور ''محاسن کلام غالبؔ'' میں عبدالرحمٰن بجنوری نے وہ بات لکھ دی جو آج بھی بلا تکلف دہرادی جاتی ہے کہ:

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس وید اور دیوان غالبؔ۔''

حالیؔ اور بجنوری کے بعد ڈاکٹر عبداللطیف نے اس موضوع سے دلچسپی دکھائی اور ان دونوں کی تنقید کے ردعمل پر اپنے تنقیدی خیالات کی بنیاد رکھتے ہوئے بہت سارے اہم مباحث پیش کیے۔

یہی وہ دور ہے جب غالبؔ کی مخالفت کا شوق بھی ابھرا اور یگانہؔ چنگیزی، نیازؔ فتح پوری اور جعفر علی خاں اثرؔ نے اس موضوع پر اپنی تحریروں سے شہرت پائی۔ اس فہرست میں یگانہؔ کا نام تو ایسا ہے کہ گویا ''غالبؔ شکن'' ان کی شناخت بن چکی ہے۔ تنقیدی و تجزیاتی افراط و تفریط کا یہ سلسلہ آگے بڑھ کر اس وقت اعتدال آشنا ہو سکا جب کہ شیخ محمد اکرام کا ''غالبؔ نامہ'' سامنے آیا اور پھر رشید احمد صدیقی نے اپنے مضمون ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا'' میں لکھا کہ:

''مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا، غالبؔ اردو اور تاج محل۔ یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں اور ہندوستان کے سوا کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے تھے۔''

رشید احمد صدیقی کے علاوہ آل احمد سرور، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ، خواجہ احمد فاروقی، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور ظ۔ انصاری غرض کہ ایسے ناقدین کی ایک لمبی فہرست ہے جنہوں نے کلام غالبؔ کی علمی و ادبی تنقید کو اپنا موضوع بنایا۔

جدید دور میں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ وغیرہ نے تنقید غالب میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''شعر، غیر شعر اور نثر'' میں مرزا غالبؔ پر چار مضامین شامل کیے تھے، لیکن ان کا اصل کارنامہ ''شعر شعور انگیز'' ہے، جس کی پہلی جلد غالبؔ اور میرؔ کے تقابلی مطالعہ کے باب میں اہم ہے اور مرزا غالبؔ کے تعلق سے کئی کارآمد باتیں کچھ اس طرح سے بیان کی گئی ہیں:

''غالبؔ اور میرؔ کی شعریات ایک طرح کی ہے، لیکن وہ

PDF Compressor Free Version

الگ الگ طرح کے شاعر اس لئے معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے تخیل کا مزاج مختلف تھا اور ان کی زبان مختلف تھی۔ غالبؔ کا تخیل آسمانی اور باریک تھا، میرؔ کا تخیل زمینی اور بے لگام۔ غالبؔ نے اپنی شاعری کے لئے اس طرح کی زبان وضع کی جسے ادبی زبان کہا جاسکتا ہے۔ میرؔ نے روز مرہ کی زبان کو شاعری کی زبان بنادیا۔"

(شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز، جلد اول، ص ۳۵، اشاعت: پہلا ایڈیشن ۱۹۹۰ء، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی)

ظاہر ہے کہ یہ ایک بے نتیجہ گفتگو اور تنقیدی کاٹ چھانٹ سے بھرپور ہے۔ اس قسم کی تنقیدی گفتگو سے شاعر کے کلام پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، نہ مثبت، نہ منفی۔ فاروقی صاحب کی تنقید کا یہی عالم وہاں بھی ہے جہاں وہ "شعر، غیر شعر اور نثر" میں غالبؔ کے تعلق سے اپنے چار مضامین میں مسلسل بحث کرتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی ایک کتاب "تفہیم غالبؔ" کے نام سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی تھی، لیکن یہ کتاب غالبؔ کے کلام کی شرح پر مبنی ہے اور شروع تا آخر غالبؔ کے منتخب اشعار کی تشریح و تاویل پیش کرتی ہے، اس لئے یہاں اس کی تفصیل مفید بحث نہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی کی ایک کتاب "غالبؔ کی تخلیقی حسیت" کے نام سے ۲۰۰۵ء میں چھپ کر سامنے آئی۔ یہ کتاب تحقیقی انداز سے رقم کی گئی ہے اور مرزا غالبؔ کا موازنہ نہ صرف ان کے ہمعصروں بلکہ پیش روؤں سے بھی کیا گیا ہے اور جن شاعروں پر تفصیل سے لکھا گیا ہے، ان میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ، مصحفیؔ، میر تقی میرؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ کے نام اہم ہیں۔ چار مضمون پر تقسیم کی گئی اس کتاب میں ۲۱ ابواب ہیں اور آخری باب "غالبؔ کی حسیت سے ہمارا رشتہ" میں کچھ نئی اور کارآمد باتیں نظر آتی ہیں مثلاً:

غالبؔ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جدید سائنس میں ایک عالم گیر طاقت بننے کی صلاحیت موجود ہے اور آنے والا زمانہ اس طاقت کے جنجال سے نکل نہیں سکے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ غالبؔ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ سائنس کلچر کی بنیادوں میں اس ہند ایرانی ثقافت کی خرابی کا پہلو بھی موجود ہے جس کے سائے میں غالبؔ کی شخصیت اور شعور کی تشکیل ہوئی تھی۔" (پروفیسر شمیم حنفی، غالبؔ کی تخلیقی حسیت، پبلشر غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۷۸)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب "غالبؔ: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات" ان کے سالہا سال کے تنقیدی غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ شونیتا ایک بودھی فکر ہے جس میں ہر فکری رویہ، ہر مکتبہ خیال، ہر نظریہ کی نفی کی جاتی ہے یا یوں کہیں کہ اس نقطہ نظر کے تحت ہر رویہ اور فکر کو رد اور صرف رد کر کے آگے بڑھا جاتا ہے۔ نارنگ صاحب نے شونیتا کی روشنی میں پایا کہ مرزا غالبؔ کا اردو کلام اور خاص کر نسخہ حمیدیہ کا کلام مذکورہ نظریہ، نظام اور آئینی زندگی کا رد کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جب نارنگ صاحب کو غالبؔ کے کلام میں یہ کلید مل گئی تو انہوں نے حالی کی کتاب "یادگار غالبؔ" سے اپنی گفتگو شروع کی اور آگے بڑھتے گئے۔ ان کے مباحث اتنے پھیل گئے کہ ان کی پوری کتاب ۶۷۸ صفحات پر مشتمل ہو کر نہایت ضخیم صورت میں سامنے آئی۔

شعر اگر صرف بیان بھر رہ جائے تو اس کی کچھ اہمیت نہیں ہوتی، لیکن اگر شعر کے معنی پوری طرح بروئے کار لانے کے باوجود بھی کچھ بچا رہ جائے تو اسے ماورائے شعر کہتے ہیں اور اس کی تلاش میں نارنگ صاحب غالبؔ کے کلام میں ڈبکی لگاتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"بالعموم غالبؔ کو ہم وہاں ڈھونڈتے ہیں جہاں روشنی ہے۔ جہاں سب معلوم ہے۔ غالبؔ کی شعریات میں سب کچھ روشنی میں ہوا ایسا نہیں ہے..... حالی یہ تو کہتے ہیں کہ خیال نیا اور اچھوتا ہے، لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غالبؔ کے یہاں خیال نیا اور اچھوتا کیسے بنتا ہے یا غالبؔ کے یہاں پہلے سے چلے آرہے مضمون سے نیا اور اچھوتا مضمون (مضمون آفرینی) یا معمولی خیال سے یکسر نیا خیال (خیال بندی) یا اس کا کوئی اچھوتا، ان دیکھا، انوکھا، نرالا، طلسماتی پہلو کیسے پیدا ہوتا ہے جو معنی کے عرصہ کو برقیا دیتا ہے یا نئے معنی کی دھ چکا چوند پیدا کر دیتا ہے جسے

(بقیہ ص ۲۷ پر)

PDF Compressor Free Version

راحت افزا

Research Scholar, Jamia Millia Islamia, New Delhi 110025 (Mob. 7827301370)

اقبالؔ کی وطنی شاعری

حب الوطنی یا وطن پرستی خالص جبلی تقاضہ ہے یہ ایک ایسا فطری جذبہ ہے جس سے انسان کی دلی وابستگی ہونا لازمی ہے۔انسان اپنے گرد و پیش سے جتنا مانوس ہوتا ہے وہ اس کی فطرت کا ہی ایک تقاضہ ہوتا ہے۔وطن سے محبت کا جذبہ نہ صرف انسانوں بلکہ چرند پرند سبھی میں موجود ہوتا ہے۔وطن کے پھل پھول، پیداوار، موسم، رسم و رواج یہاں تک کہ فطری طور پر پہنچنے والی ایذائیں بھی انسان کو پیاری ہوتی ہیں۔عین ممکن ہے کہ عام انسانی اذہان اس جذبے کے اظہار پر متوجہ نہ ہو،لیکن ایک بالغ نظر شاعر اس سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔وہ اپنی قوم کی رہنمائی اپنے عصری حالات کے مطابق بہتر سمتوں میں کرتا ہے۔علامہ اقبالؔ بھی ایسے ہی عظیم اور ذمہ دار شعرا کی صف میں اہم مقام رکھتے ہیں جن کی شخصیت میں ہمہ جہتی اور آفاقیت پائی جاتی ہے۔ وہ ایک عظیم شاعر،مفکر اور دانشور کی حیثیت سے اردو اور فارسی ادب کے آسمان پر درخشاں ستارے کی صورت میں نمودار ہوئے۔ان کی اسی تابندہ اور روشن شخصیت کا ایک عنصر ان کی وطن پرستی بھی ہے جس کا اظہار جا بجا ان کے کلام میں موجود ہے۔

علامہ اقبالؔ کا دل ہمہ وقت اپنے وطن کی محبت میں سرشار اور معمور رہتا تھا انہوں نے اپنے وطن کے تئیں اسی طرح کے نغمے گائے جس طرح ایک بلبل جو اپنے چمن کی زبوں حالی پر کبھی آہ و فغاں کے گیت گاتی ہے تو کبھی اس کی خوشبو اور سرسبزی و شادابی دیکھ کر جھوم اٹھتی ہے۔اقبالؔ کا کلام بھی اسی جذبے سے معمور نظر آتا ہے۔کہیں ان کے پر درد نغموں نے حساس دلوں کو گدگدایا تو کہیں خوابیدہ روحوں میں احساس بیداری پیدا کی۔ہندوستان سے انہیں دلی قربت تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حب الوطنی کے جذبے سے متاثر ہوکر جتنی بھی نظمیں کہیں وہ ساری کی ساری وطن پرستی سے شرابور نظر آتی ہیں۔ایسی نظموں میں ''ہمالیہ''،''صدائے درد''،''تصویر درد''،''آفتاب''،''ترانہ ہندی'' اور ''نیا شوالہ'' کافی مشہور ہیں۔

علامہ اقبالؔ کی شاعری میں حب الوطنی کے عناصر کی نشاندہی کے لئے ان کے کلام کی وسعت اور کشادگی کو ایسے تناظر میں دیکھنا ہوگا کہ قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر وطن پرستی کے مظاہرات عیاں ہوسکیں۔اقبالؔ نے اپنے کلام میں ہندستانی تاریخ،تہذیب و ثقافت، عظیم الشان شخصیات،فکر و فلسفہ،جدوجہد اور آزادی کے مختلف نشیب و فراز کو تخلیقی انداز میں پوری وسعت قلبی کے ساتھ پیش کیا۔ان کے کلام میں جب بھی زمینی اور آفاقی اشیا و اجسام،موسم،چرند پرند،کوہ و صحرا، ندی نالے،پھل پھول اور چاند تاروں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کا ذکر آتا ہے تو اس کا مفہوم خالص ملکی و وطنی ہی ہوتا ہے۔اس ضمن میں ان کی نظم ''ہمالیہ''،''ابر کہسار'' اور ''پیام مشرق'' وطن پرستی کی بہترین مثالیں ہیں جن میں بظاہر فطرت کی تصویر کشی ہے،لیکن اس کے باطن میں وطن کی محبت کی اتھاہ جذبہ کارفرما ہے۔

علامہ اقبالؔ کے یہاں وطنیت اور قومیت کا جذبہ ابتدا سے ہی حد درجہ موجود تھا اور ان کے کلام میں روایتی شاعری کے بعد شروعاتی دور سے ہی وطن پرستی کے عناصر فروغ پانے لگے تھے۔اس سلسلے میں مولانا صلاح الدین احمد کا خیال توجہ طلب ہے:

> ''جب ہم علامہ اقبالؔ کی ابتدائی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو قدرت اور عورت کے حسن کی پرستش کے بعد جو جذبہ ہمیں سب سے نمایاں نظر آتا ہے وہ وطن کی پرستش ہے اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ شاعر کی جبلت میں

PDF Compressor Free Version

اس جذبے کی تخلیق اور فروغ دونوں ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔'' (تصورات اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ ۲۰۰۶ء، ص ۲۷۶)

اقبال نے قومی اور وطنی شاعری کی بنیاد ایک ایسے دعوے اور فخر پر رکھی جو عوام الناس میں جوش و ولولہ پیدا کردے اور قوم کو پستی اور گمشدگی کے خمار سے نکال کر بلندی اور بیداری کی راہ پر گامزن کر سکے اور ان میں آگے بڑھنے کا ایسا طوفان بپا کردے جو کبھی تھمنے کا نام نہ لے۔ اقبال کا دل ہمہ وقت اپنے وطن کی تباہی و بربادی پر نالاں تھا اور وہ بہ آواز بلند پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

سن اے غافل! صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

(تصویر درد)

جذبہ حب الوطنی دوسری نعمتوں کی طرح ودیعت ایزدی ہے اور کوئی بھی اس نعمت کا منکر نہیں ہوسکتا۔ دراصل وطن کا مادی تصور جغرافیائی حدود سے وابستہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ وطن کا مادی تصور ہمیشہ قتل و غارت گری کا باعث بنا ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال ایسے وطنی تصور سے انحراف کر کے ایک آفاقی وطن کا تصور پیش کرتے ہیں جس میں اخلاقی اور روحانی عناصر موجود ہوں، اسی لئے اقبال کی قومیت اور وطن پرستی عالمگیر انسانیت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اقبال نے ایسی ہی قومی یکجہتی اور حب الوطنی کا خواب دیکھا تھا جو جغرافیائی حد بندیوں سے کہیں اوپر ہو، لیکن اس کی منکر بھی نہ ہو، جو مذہبی حد بندیوں سے برتر ہو، لیکن اس کی افادیت کو مجروح بھی نہ کرتی ہو۔ اقبال کے یہاں جو قومی یکجہتی اور حب الوطنی پائی جاتی ہے وہ دراصل انسانی قومی یکجہتی ہے جس کے عملی اظہار کے لیے ہندوستان سے بہتر اور کوئی سرزمین نہیں ہوسکتی کیوں کہ ہندوستان ہی واحد ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے، قسم قسم کی زبانیں، مختلف تہذیبیں اور موسم پائے جاتے ہیں۔

اقبال کو اپنے ملک پر بڑا فخر تھا جس کا اظہار ان کے قلم سے یوں ہوتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں جس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جس کے دم سے رشک جناں ہمارا
پربت ہو سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

(ترانہ ہندی)

اقبال جہاں ایک طرف اپنے ملک ہندوستان کی محبت میں سرشار ہو کر ہندوستان کو تمام جہانوں سے بہتر بتاتے ہیں، وہیں دوسری طرف اپنی آنکھوں سے وطن کی موجودہ صورت حال کی وہ اندوہناک تصویر بھی دیکھتے ہیں جو مغربیت کے خزاں رسیدہ چمن میں جکڑی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان جو کبھی دنیا کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا آج اجڑا چمن بنا ہوا ہے اس کی ساری رونق اور کشش معدوم ہو چکی ہے اور پھر اس صورت حال پر ان کا دل بے ساختہ یوں نوحہ خواں ہوتا ہے۔

رلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

(تصویر درد)

اقبال کی وطنی شاعری کا ایک پہلو قومی یکجہتی بھی ہے۔ ان کے نزدیک مذہب پسندی دراصل تعصب کی نفی کرنا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کی بربادی اور تباہی کا سبب یہی تعصب پسندی رہی ہے جس کی بنا پر پوری انسانیت مردہ ہو جاتی ہے۔ اقبال اس خیال کے مبلغ ہونے کے ساتھ ساتھ داعی بھی تھے کہ۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

جب ہم اقبال کی وطنی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں قومیت کے بکھرے

PDF Compressor Free Version

ہوئے عناصر کو یکجا کیا اور ایک فلسفیانہ نظام کے تحت قومی یکجہتی کے تصور کو استحکام عطا کر کے اسے عالمگیر سطح پر متمیز کیا۔ یہی وجہ کہ اقبالؔ کی وطنی شاعری میں نہ کوئی مذہب ہے، نہ رنگ و نسل کا بھید بھاؤ، نہ ذات پات کی اونچ نیچ اور نہ علاقائی پابندیاں وہ سرتاسر قومی یکجہتی کی عمدہ مثال ہے۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری میں وطنی اتحاد کی تعلیم جس مخلصانہ انداز سے دی ہے، وہ آج بھی دلوں پر گہرا اثر ڈالنے کے لئے کافی ہے ۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

(نیا شوالہ)

اقبالؔ کا یہ ''نیا شوالہ'' گواہ ہے کہ وہ محبت کی ایک ایسی دنیا بسانا چاہتے تھے جہاں نہ رام رحمان کا جھگڑا ہو نہ مسجد و مندر کا فساد۔ وہ لوگوں کو ایسی شراب پلانا چاہتے تھے جس کی مستی سے سارا ہندوستان مدہوش ہو کر جھوم اٹھے وہ مے کچھ اور نہیں بلکہ حب الوطنی کی مے ہے۔ اقبالؔ ایک ایسا ''نیا شوالہ'' بنانے کی تعلیم دیتے ہیں جہاں پتھر کے چھوٹے چھوٹے بت نہ ہوں بلکہ ان کا شوالہ ان کا اپنا وطن ہو، اس لئے وہ کہتے ہیں ۔

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دے نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیش میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامان آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

اقبالؔ کی زندگی اور ان کے اسفار کی تفصیلیں گواہ ہیں کہ وہ جب اپنے وطن سے دور تھے تب بھی حب الوطنی کو کبھی فراموش نہیں کر سکے اور وطن پرستی اور وطن کی عظیم ہستیوں کے تئیں عقیدت و محبت کا والہانہ نذرانہ پیش کیا۔ گوتم بدھ، شیو مہاراج، رام، گرو نانک، برترہری، سوامی رام تیرتھ، ٹیپو سلطان، غنی کاشمیری، غالبؔ، بیدلؔ اور محمد علی جوہرؔ جیسی شخصیتوں کے حوالے سے انہوں نے ملک کی تاریخ، تہذیب، فکر اور فلسفہ کے باب میں اکابرین ہند کی اعلیٰ تعلیمات نیز ان کے ذریعہ پروان چڑھنے والے بہترین اخلاقی اقدار سے استفادہ کر کے قوم کو عصری تناظر میں بیش بہا نصیحتوں سے نوازا جو دراصل ان کی حب الوطنی کی ہی دلیل ہے اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

چشتی نے جس زمیں پر پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

(ہندوستانی بچوں کا قومی گیت)

اقبالؔ کی وطن سے والہانہ محبت کا اندازہ اس وقت شدت اختیار کر جاتا ہے جب وہ اپنے وطن سے دور یورپ میں جا بستے ہیں کیوں کہ وطن سے محبت کا جذبہ نہ صرف انسانوں میں بلکہ جانوروں میں بھی موجود ہوتا ہے۔ طائر بھی اپنے نشیمن سے بچھڑ کر پھڑکتا رہتا ہے۔ وطن سے محبت کا پاکیزہ اور مقدس جذبہ تو ولیوں اور نبیوں میں بھی موجود تھا رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن مکہ سے بے لوث محبت تھی جس کا اظہار وہ اکثر و بیشتر کیا کرتے تھے اور جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے بادشاہ ہونے کے باوجود اپنے وطن کنعان کے بھکاری کو بھی خوش قسمت تصور کرتے تھے تو اقبالؔ جیسا حساس دل شاعر وطن کی محبت جذبے سے کیوں کر دست بردار ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ مغرب میں رہ کر بھی اپنے وطن کو نہ بھول سکے۔ بلکہ یورپ کی دلکشی اور رنگینی میں بھی اپنے وطن کی خوشبو تلاش کرتے اور بزم جہاں کے ہنگاموں کی دلکشی کا اعتراف کرنے کے باوجود خود سے مخاطب ہو کر یہ کہتے رہے کہ ۔

PDF Compressor Free Version

میں نے اے اقبالؔ یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے کوہ پیماؤں میں تھی

اقبالؔ نے حساس طبیعت پائی تھی یہی وجہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد اقبالؔ کے سفر یورپ نے ان کی حب الوطنی کے تصور میں مزید وسعت اور بالیدگی پیدا کردی چنانچہ ۱۹۳۰ء میں اپنی ایک تقریر کے دوران انہوں نے صاف صاف کہا کہ:

''ہندوستان کی سیاسی غلامی، تمام ایشیا کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اسے اظہار نفس کی اس مسرت سے محروم کردیا ہے جس کی بدولت کبھی اس میں ایک شاندار تہذیب پیدا ہوئی تھی۔'' (بحوالہ اقبالؔ اور انسان: اشفاق احمد، آندھرا پردیش، ساہتیہ اکیڈمی ۱۹۷۱ء ص ۴۳)

اقبالؔ اپنی وطنی شاعری کے ذریعہ انسانوں کو ازلی و ابدی اور روحانی بنیادوں پر متحد کرنا چاہتے تھے اور غلامی کی ذلت سے نجات کے لئے جہاں وہ تعصب، نفرت، فرقہ پرستی اور نفاق سے اہل ملک کو بچانا اپنا اولین فریضہ سمجھتے تھے وہیں محبت و اخوت، بھائی چارگی اور اتحاد و اتفاق کو انسان زندگی کا لازمی جز بھی قرار دیتے تھے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا اور اسی یقین کو انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہمیشہ عام بھی کیا اقبالؔ کی نظر میں محبت کی بڑی قیمت ہے اور انہوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ ''محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے'' ان کا عقیدہ ہے کہ آزادی بھی اصلاً محبت ہی میں پوشیدہ ہے اور غلامی دراصل اس بات کا نام ہے کہ ہم آپسی اختلاف میں گھرے رہیں ۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے

❁❁❁

غالبؔ کے جدید دور کے نقاد (ص ۲۳ سے آگے)

عرف عام میں سابقہ تنقید، طرفگی خیال یا ندرت و جدت مضامین سے منسوب کرتی آتی ہے۔ غالبؔ کی ذہنی ساخت میں آخر ایسا کیا ہے کہ اگر اس میں سیدھی بات بھی داخل ہوتی ہے تو بل کھاتی ہوئی نکلتی ہے۔ غالبؔ کئی بار اس مقام پر ملتے ہیں جہاں عام زبان میں گفتگو کرنا محال ہے یا جہاں آبگینہ تندئی صہبا سے پگھلنے لگتا ہے۔ عام زبان تعینات و ثنویت کی شکار ہے۔ غالبؔ اپنے ارضی احساسات و کیفیات کی واردات میں اس سے ماورا ہوجانا چاہتے ہیں، یعنی State of no mind بالخصوص نسخہ حمیدیہ میں بہت سا کلام ایسا ہے اور بعد میں بھی جو کسی ایسے تجربہ کی تہہ لیتا ہے جو ذہن و شعور سے آگے کی بات ہے۔ عام زبان روزمرہ تجربے کی زمین پر بھی پوری طرح قادر نہیں ہوسکتی تو ذہن و شعور سے آگے کی بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.....ان کا (غالب کا) سب سے بڑا سرچشمہ فیضان بودھی فکر (شونیتا) ہے جو بہ جنسہ نہ تو مذہبی ہے نہ ماورائی ہے نہ یہ کوئی گیان دھیان یا مسلک یا عقیدہ ہے۔ یہ فقط فکر کا ایک پیرایہ یا سوچنے کا طور ہے۔ ہر ہر موقف، ہر مظہر، ہر عقیدہ، ہر تصور کو رد کرنے کا یا اس کو پلٹ کر اس کے عقب میں دیکھنے کا۔ چونکہ دکھائی دینے والی حقیقت فقط اتنی یا وہی نہیں ہے جو وہ نظر آتی ہے۔'' (غالبؔ معنی آفرینی.....ص ۱۴ تا ص ۱۹)

مذکورہ سطریں نارنگ صاحب کی کتاب کے دیباچہ سے لی گئی ہیں۔ دیباچہ ہی میں نارنگ صاحب نے پوری کتاب کا ایک طرح سے نچوڑ پیش کردیا ہے۔ مجھے یہاں اپنے موضوع کے تعلق سے خلاصہ کے طور پر صرف اتنا کہنا ہے کہ غالبؔ کے تعلق سے لکھی گئی یہ تنقیدی اعتبار سے سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

محمد عبداللہ

(Mob. 8873789494)Research Scholar, Urdu Deptt. L.N.Mithila University, Darbhanga

پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید نگاری

پروفیسر عبدالمغنی کا تعلق اردو تنقید نگاروں کی اس نسل سے تھا جو کلیم الدین احمد اور پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ کے معاً بعد منصۂ شہود پر آئی۔ اس پیش رو نسل میں پروفیسر سید احتشام حسین، پروفیسر عزیز احمد اور مجنوں گورکھپوری جیسے جید ادب شناس اور نقاد کا شمار بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کے ساتھ بساط تنقید وادب میں شامل ہونے والوں میں بہار کے نامور نقاد پروفیسر وہاب اشرفی کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام بھی لئے جاسکتے ہیں، مگر اس فرق کے ساتھ کہ وارث علوی اور گوپی چند نارنگ ڈاکٹر عبدالمغنی سے نسبتاً سینئر رہے ہیں۔ اردو کے دوسرے آوردہ نقاد ڈاکٹر وزیر آغا اور پروفیسر محمد حسن بھی عبدالمغنی سے سینئر تھے۔ محمد حسن عسکری نے بھی جن کا زمانہ ہندوستان کی آزادی کے آس پاس کا ہے، اسی زمانہ میں شہرت حاصل کی، اس طرح وہ بھی عبدالمغنی کے پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزید برآں پروفیسر عبدالمغنی کے ہم عصروں میں پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر شارب ردولوی اور پروفیسر عتیق اللہ کے نام بھی آتے ہیں ان میں صرف ایک یعنی پروفیسر اسلوب انصاری پروفیسر عبدالمغنی سے سینئر نقاد ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی انگریزی ادب کے استاذ تھے۔ انہوں نے انگریزی کے مشہور نقاد اور شاعر ٹی ایس ایلیٹ پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انہیں اپنے موضوع پر زبردست گرفت حاصل تھی۔ انہوں نے مغربی ادبیات کا خاطر خواہ مطالعہ کر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں ان کی نظر یوروپی تہذیب اور کلچر پر بھی گہری تھی، لیکن وہ مزاجاً مشرقی تھے اور خواہ مخواہ انگریزیت کو پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ مغربی تہذیب وتمدن کے نکتہ چیں تھے۔ اس اعتبار سے وہ اکبر الٰہ آبادی اور علامہ اقبال کے سچے جانشیں کہے جاسکتے ہیں۔ علامہ اقبال کا جو فکری اپروچ ہے اور ان کی جو سیاسی نظر ہے تقریباً وہی اپروچ اور سیاسی نظر پروفیسر عبدالمغنی کی بھی ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی نے تنقیدی مضامین پچاس کی دہائی سے لکھنا شروع کئے۔ یہ ان کی طالب علمی کا زمانہ تھا اور دراصل ان کے ادبی کیریر کی ابتدا بھی اسی زمانہ میں ہوئی۔ عبدالمغنی صاحب سنجیدہ مزاج اور پھکڑپن سے دور انسان تھے۔ غیر ضروری باتوں سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں ٹو دی پوائنٹ (To the point) گفتگو کا انداز پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی تنقید میں شروع زمانہ سے فکری کمٹ منٹ کے عادی رہے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین طالب علمی کے زمانہ ہی سے ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے۔ انہوں نے جب لکھنا شروع کیا تھا تو ایک طرف ترقی پسندی کے اثرات نمایاں تھے اور دوسری طرف جدیدیت کے خدوخال بھی واضح ہونے لگے تھے۔ ابھی ان دو فکری رویوں اور رجحانوں میں ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی تھی، لیکن بہت جلد جدیدیت نے ترقی پسند پر حملہ بول دیا، چنانچہ پچاس اور ساٹھ کی دہائی ادبی یورش کی دہائی کے طور پر یاد کی جاتی ہے، جب کہ ترقی پسندوں اور جدید لکھنے والوں کے درمیان قلمی اور زبانی دونوں قسم کی جنگ اپنے عروج پر تھی۔ اس گرما گرم ادبی ماحول میں اچھے خاصے لکھنے والے بہکنے لگے تھے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ عبدالمغنی کے یہاں کسی قسم کی شدت یا کسی قسم کا ردعمل دیکھنے کو نہیں ملتا۔ انہوں نے توازن کی راہ اپناتے ہوئے اپنے خیالات کے اظہار کا طریقہ ڈھونڈا۔

پروفیسر عبدالمغنی نے ترقی پسند ادب اور جدید ادب دونوں پر لکھا ہے، لیکن ان کے مضامین میں طنز اور تمسخر یا بے جا قسم کی نقادانہ

PDF Compressor Free Version

چودھراہٹ نہیں پائی جاتی۔ وہ شعراادب کو بھی اخلاقی ضابطوں کے تحت دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔ انہوں نے شعروشاعری کو محض تفریح کا ذریعہ کبھی نہیں سمجھا۔ انہوں نے جوشؔ، جگرؔ، حسرتؔ، فانیؔ، فراقؔ، فیضؔ وغیرہ پر مضامین لکھے ہیں اور کوشش کی ہے کہ ان شاعروں کی صحیح صحیح شاعرانہ شبیہ سے تعارف کرادیں۔ وہ غالبؔ، میرؔ، نظیرؔ سب کے پرستار ہیں، لیکن ان کی نظر میں علامہ اقبالؔ کا درجہ امتیازی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقبالؔ پر سب سے زیادہ کتابیں لکھ کر ماہرین اقبالیات میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ ماہر اقبالیات ہونے کے باوجود وہ میرتقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہیں۔ مرزا غالبؔ پر ایک مختصر سی کتاب بھی ان کی تصنیف ہے۔ فکشن نگاروں میں انہوں نے قرۃ العین حیدر پر خاص توجہ دی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر اور ان کے نثری اسلوب پر بھی انہوں نے الگ سے ایک کتاب قلم بند کی ہے جس وجہ سے آزادیات میں بھی انہیں اہم مقام حاصل ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کے بیشتر تنقیدی مضامین جو وقتاً فوقتاً ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے، ان کے ابتدائی تنقیدی مجموعوں، مثلاً ''جادۂ اعتدال'' اور ''تشکیل جدید'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان تنقیدی مجموعوں میں عبدالمغنی صاحب نے اپنی تنقید نگاری کے تعلق سے بڑے کام کی باتیں بیان کی ہیں۔ مثلاً وہ دیباچوں میں تعمیری اور اخلاقی تنقید کی وکالت کرتے ہوئے اردو ادب میں اس کا جواز بھی تلاش کرتے ہیں۔ اپنے اس جواز کے لئے وہ حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ کو سامنے لاتے ہیں۔ ان تینوں میں انہیں علامہ اقبالؔ تعمیری شخصیت کی سب سے بڑی مثال دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اقبالؔ کی اسلامی شاعری کو اپنی تنقید کی ڈھال بناتے ہیں اور ان کے لکچرز کا گہرا مطالعہ کرکے اس سے بھی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی کی نگاہ میں ادب بھی تعمیری جہت میں ویسا ہی کام کرسکتا ہے جیسا مذہب کرتا ہے۔ مذہبی فکر جب ادب میں تبدیل ہوتی ہے تو اس کی جہت مقصدی اور تعمیری ہوجاتی ہے۔ اردو میں اس کی سب سے بڑی مثال علامہ اقبالؔ ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید کثیر جہتی اور بین العلومی مطالعہ سے لیس ہے۔ اس تنقید کی اٹھان ایسی ہے کہ اس میں عالمی فکر کی سمائی نظر آتی ہے۔ عبدالمغنی کی تنقید کا معیار مقامی سے زیادہ عالمی اور بین الاقوامی ہے۔ انہوں نے مغربی تنقید کے گہرے مطالعے سے اثر قبول کرتے ہوئے افلاطون، ارسطو، لونجائسن، ہیوریس، فلپ سڈنی، بن جانسن، کالرج، ورڈزورتھ، ٹی ایس ایلیٹ، آرنلڈ، رچرڈز وغیرہ کے مراتب مدارج ہمیشہ اپنی نگاہ میں رکھا، اس لئے جب کبھی انہوں نے فکر ونظر کے تعلق سے کوئی عالمانہ بات کہی تو ان کی نظر میں مذکورہ تنقید نگاروں کے اقوال وافکار بھی رہے اور انہوں نے کسی قسم کی لغزش نہیں کی۔ عبدالمغنی صاحب نے تنقید کو ایک آزاد ڈسپلن کے طور پر سمجھا اور ہمیشہ اس کی قدر کرتے رہے اور اکابر تنقید نگاروں کے خیالات سے فیض بھی اٹھایا۔

پروفیسر عبدالمغنی کا سب سے قیمتی اثاثہ اقبالؔ کی شاعری اور اقبالؔ کے فلسفیانہ افکار کے تعلق سے وجود میں آتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب پروفیسر عبدالمغنی اپنی ناقدانہ حیثیت بھی منوا رہے تھے اور اپنے پیش رو نقادوں سے داد بھی وصول کررہے تھے۔ اسی زمانہ میں پروفیسر کلیم الدین احمد کی ایک کتاب ''اقبال: ایک مطالعہ'' چھپ کر سامنے آئی جو علامہ اقبالؔ کی شاعرانہ حیثیت کو چیلنج کرتے ہوئے عالمی ادب میں ان کے مرتبہ اور مقام سے انکار کرتی ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد اقبالؔ کو شاعر نہیں گردانتے بلکہ انہیں صرف ایک ایسا مبلغ تسلیم کرتے ہیں جو اپنے اسلامی افکار کو شعری ہیئتوں میں ظاہر کردیتا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کو اقبالؔ پر کلیم الدین احمد کی یہ تنقید ناگوار محسوس ہوئی اور انہوں نے وہ ان کی تنقید کا جواب لکھا جس کے نتیجے میں اقبالؔ کی شاعری، فن اور فکر کے تعلق سے کئی نکات سامنے آئے۔ اقبالؔ کا نظام فن اور نظریہ خودی اور دیگر تحریریں عبدالمغنی کے تنقیدی کارناموں میں ایک علاحدہ شناخت رکھتی ہیں، چنانچہ ان کی تنقیدی کتابوں کا اسلوب بھی الگ ہے۔ عبدالمغنی آخری عہد تک آتے آتے اسلامی فکر اور اقبالؔ کی شاعری میں اس قدر رچ بس گئے تھے کہ وہ بعض تنقیدی پیمانوں کو بھلا بیٹھے تھے۔ ادب میں معروضیت ہوتی ہے اور سائنٹفک استدلال کے سہارے کسی منطقی نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے، یہ سب باتیں وہ بھولنے لگے تھے۔ انہیں ایک قسم کی ضد ہوچکی تھی۔ وہ اقبالؔ کو عالمی سطح کا سب سے بڑا شاعر کہلوانا چاہتے تھے اور اس کام کے لئے

PDF Compressor Free Version

انہوں نے ہندو پاک کے ادبی اداروں سے خوب کام لئے۔

جہاں تک عبدالمغنی کے تنقیدی نثر کا سوال ہے موصوف سنجیدہ لکھنے والے تھے اور یا وہ گوئی یا طنز سے انہیں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے بعض ہمعصر تنقید نگاروں کا شعار ایسا تھا کہ وہ تنقید کرتے وقت گالیاں تک دیتے تھے۔ طنز، تمسخر، پھبتی کسنا عام بات تھی اور اپنی انگریزی دانی کا مظاہرہ کرنا ان کا شیوۂ خاص تھا۔ ایسے نقاد اپنی علمیت کا رعب قارئین پر بیٹھانے کے لئے طرح طرح کے اسلوب اپناتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز و گفتار یا اسالیب نقد، صحت مند تنقید سے دور دور کا بھی رشتہ نہیں رکھتے۔ عبدالمغنی نے کبھی بھولے سے بھی ایسا طرز نہیں اپنایا جس سے ان کی ذات نمایاں ہو یا داد خواہی کی نفسیات جھلکنے لگے۔

عبدالمغنی ایک نقاد ضرور تھے، لیکن اس سے پہلے ایک سلجھے ہوئے اخلاق مند انسان تھے۔ اسلامی طرز فکر کے حامل ہونے کی وجہ سے ان کے عادات و خصائل میں تصنع اذرہ برابر نہیں تھا۔ وہ عملی سطح کے انسان اور اخلاق کے پیرو تھے۔ اصول کی پابندی کرنا اس کی عادت تھی اس وجہ سے ان کے اندر ایک نوع کی سختی چلی آئی تھی۔ یہ سختی کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں تھی۔ یہی اصول اور ضابطے ان کی تنقیدی نثر میں بھی جھلکتے نظر آتے ہیں، جہاں وہ تہذیبوں کے ٹکراؤ اور افکار کی یورش سے الجھتے ہیں تو واضح طور پر اسلامی فکر کی وکالت کرتے ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے اندھے طور پر قائل نہیں تھے، بلکہ انہوں نے اقبال کی شاعری کا کئی سطح پر مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ انہیں لگتا تھا کہ اقبال، ملٹن، دانتے اور گوئٹے کی سطح کے عظیم شاعر تھے۔ کبھی کبھی وہ ان مغربی شاعروں سے بڑھا ہوا بھی اقبال کو دکھاتے تھے اور وہ ایسا خاص اپنی تنقیدی سوچ کے تحت کرتے تھے اور بہر حال اس میں ایک وزن ضرور تھا۔

علامہ اقبال عبدالمغنی کی کمزوری نہیں طاقت تھے اور اس طاقت کے ذریعہ انہوں نے اپنی پوری تنقید کو سنوارا اور اردو کی جدید تنقید کو ایک نیا نظریہ دیا۔ اگر ہم پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید نگاری کو کوئی خاص نام دینا چاہیں تو انہیں پس نو آبادیاتی فکر کا حامل ایسا نقاد کہہ سکتے ہیں جو مغرب کو اپنی تنقید کے ذریعہ مشرق کا پیغام دینا چاہتا ہے۔ گویا عبدالمغنی نے بھی تنقید کی سطح پر وہی کام انجام دیا ہے جو علامہ اقبال نے اپنی فارسی اور اردو شاعری کے ذریعہ انجام دیا۔ یہ کام مغرب سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے ہنر سے عبارت تھا اور یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ عبدالمغنی کا اسلوب تنقید بلاشبہ اس کی عمدہ مثال ہے۔ ❁❁

قومی یکجہتی کے علمبردار: سرسید احمد خاں (ص ۱۲ سے آگے)

کرنی چاہیے، اگر ایسا ہوگا تو سنبھل جائیں گے، نہیں تو دونوں قومیں تباہ و برباد ہو جائیں گی۔" (متن تقریر بحوالہ "یادوں" لکھنؤ، اکتوبر ۲۰۱۳ء، ص ۳۵)

سرسید احمد خاں کا قومی نظریہ پوری قوم کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے ذہن و عمل سے عبارت تھا۔ ان کی تحریک کا مقصد صرف مسلمانوں کی فلاحی اسکیموں تک محدود نہیں تھا۔ وہ مشترکہ تہذیب کو زندگی کا حصہ بنانے پر زور دیتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان ایک ایسا خوبصورت ملک ہے، جس کی دو آنکھیں ہیں ایک ہندو کی صورت میں اور دوسری مسلمان کی صورت میں۔ انہوں نے کئی بار اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے دونوں کی صورتیں ایک جیسی ہو گئی ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اپنا لیں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں اختیار کر لیں۔ یہاں تک کہ دونوں نے مل کر ایک بول چال کی زبان اردو کو جنم دے دیا۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید احمد نے نہ صرف مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا بلکہ اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک میں ملک کی تمام اقوام کو آگے بڑھانے کی کوششیں کیں۔ سرسید اور آج کے زمانے میں ایک صدی سے زیادہ کا فاصلہ ہے، لیکن ان کے خیالات و نظریات، ان کی تحریک اور ان کے پیغام کی عصری معنویت آج بھی قائم ہے اور یہ ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم قومی یک جہتی کی علمبردار اس تاریخ ساز شخصیت کے افکار سے فائدہ اٹھائیں اور اس کے بتائے ہوئے قومی اور اصلاحی راستوں پر گامزن ہو کر ملک میں قومی یکجہتی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

افسانے

شفیع مشہدی

F-6, Grant Pallavi Apartment, Judge Road, Patna 800004

پنڈ دان

خان بہادر اپنے چیمبر سے نکل کر برآمدے میں آئے تو ان کے موکلوں کی قطار کھڑی ہوگئی۔ آداب، سلام، پرنام اور ''ہجور'' کی آوازیں گونج گئیں۔ مسکراتے ہوئے سبھوں کا جواب دیتے ہوئے خان بہادر اس گوشے کی طرف بڑھے جہاں کچھ آرام کرسیاں رکھی تھیں اور ان میں سے ایک پر اوما شنکر نیم دراز خوابیدہ تھے۔

خان بہادر رک کر غور سے انہیں دیکھتے رہے۔ چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ سر منڈا ہوا تھا اور کپڑے بھی چور چور تھے، حالانکہ اوما شنکر اتنے خوش لباس تھے کہ کیا مجال کہ کرتے کی آستینوں پر بھی شکن دکھائی دے۔

خان بہادر، سید جلال الدین ایڈوکیٹ شہر کے ممتاز ترین رؤسا میں تھے اور اوما شنکر کے خاندان سے ان کا پشتینی رشتہ تھا۔ شہر سے بیس پچیس کیلو میٹر دور اوما شنکر کا گاؤں دولت پور تھا جہاں کبھی خان بہادر کے اجداد بھی رہتے تھے، مگر خان بہادر کے والد، جو علاقے کے بڑے زمیندار تھے اور آنریری مجسٹریٹ بھی تھے، شہر منتقل ہوگئے تاکہ بچوں کو اچھی تعلیم مل سکے اور ویسے بھی دیہات میں بجلی کی کمی اور آمد و رفت کی دشواریوں سے نئی نسل دیہات سے برگشتہ ہو چکی تھی، پھر زمینداری بھی ختم ہوگئی تو گاؤں سے رشتہ تقریباً ٹوٹ سا گیا۔

گاؤں میں ان کی ٹوٹی ہوئی حویلی اب غیر آباد تھی، مگر گاؤں کا قبرستان آباد تھا اور اس کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی، اس لئے کہ خاندان کے تمام لوگ مرتے تو شہر میں تھے، مگر دفن گاؤں کے قبرستان میں ہی ہوتے تھے۔ گویا جہاں کی مٹی تھی، وہیں جاتی تھی۔

خان بہادر خاموشی سے اوما شنکر کو سویا دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ یہ شخص انہیں کتنا عزیز رکھتا ہے، کتنی عزت کرتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ چند سال پہلے جب اوما کی بیٹی کی شادی تھی تو اوما شنکر نے بضد ہو کر خان بہادر سے کنیادان کرایا تھا، تب سے اوما کی بیٹی سدھا، خان بہادر کے گھر کو میکہ سمجھنے لگی تھی۔

یہ ناممکن تھا کہ سدھا کبھی دولت پور جائے اور خان بہادر کے گھر نہ جائے۔ خان بہادر بھی اوما شنکر کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور ہمیشہ ''اوما'' کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ اوما کا یہ حال تھا کہ زندگی کا کوئی فیصلہ خان بہادر کی اجازت کے بغیر نہیں کرتے تھے۔

خان بہادر نے بڑی ہی مشفقانہ انداز میں پکارا:

''اوما، اوما.....''

اور اوما ہڑبڑا کر ایسے اٹھے جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ فوراً پیر چھو کر پرنام کیا اور ہاتھ جوڑے کھڑے ہوگئے۔

''پرنام ہجور''

''خوش رہو'' خان بہادر نے دعائیں دیں۔

''تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ سر بھی منڈا ہوا ہے، کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں ہجور! ہم گیا جی سے آئے ہیں۔ سورگ باشی پتا جی کا پنڈ دان کرنے گئے تھے ہم۔''

اوما شنکر ہاتھ جوڑے بڑے احترام کے ساتھ بات کر رہے تھے۔

''چلو اندر چلو'' کہتے ہوئے خان بہادر اوما کو ڈرائنگ روم میں لے آئے اور عبدل کو آواز دی۔ ملازم آیا تو بولے:

''جاؤ بیگم صاحبہ سے کہہ دو کہ اوما آئے ہیں۔ ناشتہ چائے لاؤ اور کل جو کباب بنا تھا، وہ بھی لانا، اوما کو پسند ہے۔''

''ہجور، کباب مت منگائیے۔ پتر پکش ہے، اس لئے ماس مچھلی نہیں کھاتے ہیں۔'' اوما لجاجت سے بولے۔

PDF Compressor Free Version

''ارے ارے ہم بھول گئے تھے۔''

پھر انہوں نے عبدل کو آواز دی۔

''دیکھو بیگم صاحبہ سے کہہ دینا کہ پتر پکش ہے، اس لئے اوما کے لئے ''شدھ ساتوک ہی بھیجیں۔'' اوما شنکر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے:

''ہجور بیگم صاحبہ کو کاہے کشٹ دے رہے ہیں۔ ہم کھا پی کر آئے ہیں۔''

''ہم کب کہہ رہے ہیں کہ تم بھوکے ہو۔''

خان بہادر ہنسنے لگے۔ پشتوں کا یہ رشتہ چل ہی رہا تھا کہ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے خان بہادر کا انتقال ہوگیا۔ سارے شہر میں کہرام مچ گیا اور اوما شنکر تو خان بہادر کے بیٹے جمال سے لپٹ کر ایسے روئے تھے کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹ گیا۔ جنازہ چلنے کو تیار ہوا تو اوما شنکر روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر جمال سے کہنے لگے:

''ہجور! ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم جنازہ کو کاندھا دیں۔''

جمال احمد نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کیسی بات کرتے ہیں اوما بابو۔ اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جیسے میرے ابا تھے، ویسے ہی آپ کے بھی پتا سمان تھے۔''

جمال احمد اوما شنکر سے گلے مل کر رونے لگے اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ خان بہادر کی حویلی سے قبرستان تک اوما شنکر جنازہ اپنے کاندھے پر لئے ایسے چل رہے تھے جیسے خود اپنی لاش اٹھائے چل رہے ہوں۔

خان بہادر چلے گئے، مگر رشتہ قائم رہا۔ ان کے بیٹے جمال احمد اور اوما شنکر کی دوستی کا یہ عالم تھا کہ ایک دوسرے کے بغیر چین نہیں تھا۔ اوما شنکر عمر میں بڑے تھے، مگر وہ ہمیشہ جمال کو ہجور کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ جمال نے کئی بار انہیں روکا بھی۔

''اوما بابو! آپ مجھ سے بڑے ہیں..... دس گاؤں میں آپ سے بڑا کوئی زمیندار نہیں۔ لوگ آپ کے آگے سر جھکاتے ہیں اور آپ مجھے ''ہجور'' کہتے ہیں تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔'' اوما مسکرانے لگے اور ہاتھ جوڑ کر بولے:

''ہجور! ہم خان بہادر کو ہمیشہ ہجور کہتے تھے، تو ہجور کا بیٹا بھی تو ہجور ہی ہوا۔ ہم کو منع مت کیجئے، ہم ہجور ہی کہیں گے۔''

وہ ہنسنے لگے:

''اس ہجور میں جو اسنیہہ ہے، جو اپنا پن ہے، وہ ہم سمجھتے ہیں۔ آپ بھی سمجھئے۔ آپ ہم کو اوما بابو کیوں کہتے ہیں؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''اس لئے کہ آپ ہم سے بڑے ہیں۔'' جمال نے کہا۔

''نہیں! بابو اس لئے کہتے ہیں کہ آپ کے دل میں اوما کے لئے اسنیہہ ہے۔''

خان بہادر کے انتقال کو ایک سال ہونے کو آیا تھا، مگر شاید ہی ایسا کوئی اتوار گزرا ہو جب اوما شنکر، خان بہادر کے گھر نہ آئے ہوں، بیگم صاحبہ کو سلام نہ کیا ہو اور جمال احمد کو ہجور نہ کہا ہو۔

وقت گزرتا گیا، مگر اوما شنکر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ باقاعدگی سے تقریباً ہر اتوار کو جمال احمد سے ملنے ضرور آتے تھے اور جب بھی آتے تو خالی ہاتھ نہیں آتے تھے، کبھی گیا جی کا پیڑا، کبھی تلکٹ، تو کبھی بلگرامی، الغرض وہ کچھ نہ کچھ لے کر ہی آتے تھے۔

جمال نے ہنستے ہوئے اعتراض بھی کیا تھا:

''اوما بابو! آپ ہر بار مٹھائی وغیرہ کیوں لے کر آتے ہیں۔ مجھے Diabetes کرائیے گا کیا؟''

''بھگوان نہ کرے ہجور کہ آپ کو کوئی بیماری ہو۔ بات یہ ہے کہ بزرگوں کا کہا ہوا ہے کہ پیر فقیر اور بادشاہ کے یہاں خالی ہاتھ نہیں جانا چاہئے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔

انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگلے مہینہ ہجور تیار رہئے گا، سدھا کے سسرال جانا ہے، آپ نانا بن گئے ہیں۔''

''ارے واہ! یہ خوش خبری تو آپ نے بتائی ہی نہیں۔ مبارک ہو'' جمال احمد نے خوش ہو کر کہا۔

''بتا ہی تو رہے ہیں ہجور۔ آپ کا چلنا ضروری ہے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، ہم ضرور چلیں گے۔''

جمال احمد نے کہا۔

دو اتوار گزر گئے، مگر اوما شنکر کا کہیں پتا نہیں تھا۔ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ جمال احمد نے دولت پور آدمی بھی بھیجا تو پتا چلا کہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ جمال احمد اسی اُدھیڑ بن میں تھے کہ اچانک اوما شنکر

PDF Compressor Free Version

نمودار ہوئے۔ ''ہجور آداب'' کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ تھکے تھکے ہوئے سے تھے اور سر منڈا ہوا تھا۔

جمال احمد غور سے انہیں دیکھنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ اوما شنکر کی عمر دس سال بڑھ گئی تھی۔

''کیا بات ہے اوما بابو؟ آپ پریشان سے ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' جمال احمد نے بڑی محبت سے پوچھا۔

''ہاں ہاں سب ٹھیک ہے ہجور! پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' اوما بولے۔

''تو کہاں چلے گئے تھے؟ اتنے دن غائب رہے؟ ہم نے کباب بنوایا تھا۔ آپ نہیں تھے تو کھانے میں مزہ نہیں آیا۔''

جمال احمد نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''ہم ویسے بھی کباب نہیں کھاتے۔ پتر پکش ہے نا ہجور۔ ہم گیا جی چلے گئے تھے۔'' اوما شنکر نے سنجیدگی سے کہا۔

''گیا جی کیوں گئے تھے؟'' جمال احمد نے پوچھا۔

''پوروجوں کی آتما کی مکتی کے لئے پنڈ دان کرنے جاتے ہیں گیا جی۔'' اوما نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''مگر آپ تو پچھلے سال اپنے پتا جی کا پنڈ دان کر چکے تھے۔ اب کیوں گئے تھے۔''

''کہا تو ہجور کہ پنڈ دان کرنے گئے تھے۔''

اوما سنجیدگی سے بولے۔

''مگر اب کس کا پنڈ دان کرنے گئے تھے۔'' جمال احمد نے زور دے کر پوچھا۔ اوما شنکر تھوڑی دیر چپ رہے پھر غور سے جمال احمد کو دیکھتے ہوئے دھیمے دھیمے سے بولے:

''خان بہادر کا پنڈ دان کرنے گئے تھے۔''

اوما کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور جمال احمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، مگر وہ اوما شنکر کے جھکے ہوئے سر اور آنسوؤں سے تر آنکھیں دیکھتے رہے۔ اوما شنکر پھر بولے:

''یہی سوال گیا جی میں پنڈت جی نے پوچھا تھا۔'' اوما بابو ہنستے ہوئے بولے۔

''پنڈ دان تو پنڈت کراتے ہیں۔ اس وقت پنڈت جی نے پوچھا کہ کس کے نام سے پنڈ دان کرنا ہے تو میں نے کہا:

''خان بہادر سید جلال الدین.....'' پنڈت جی ہکا بکا، میرا منہ دیکھنے لگے۔

''ججمان، یہ تو مسلمان کا نام ہے۔'' انہوں نے سوال کیا۔

''پنڈت جی! ہندو مسلمان تو زندہ لوگ میں ہوتے ہیں۔ مرنے پر سب ایک ہو گئے۔ آپ کو دکشنا سے مطلب ہے، سو لے لیجئے اور جیسا ہم کہتے ہیں، کیجئے۔ میں نے اتنے سخت لہجے میں کہا تھا کہ پنڈت جلدی جلدی شلوک پڑھنے لگے اور ہم سے پنڈ دان کروایا۔''

اوما شنکر بابو کا لہجہ سپاٹ تھا، مگر خان بہادر کا ذکر آتے ہی ان کی آواز بھرا گئی۔

''تو آپ ابا کا پنڈ دان کر کے آرہے ہیں؟''

جمال کی آواز میں حیرت بھی تھی اور درد بھی۔ وہ چند لمحے غور سے اوما بابو کو دیکھتے رہے پھر آگے بڑھ کر اوما بابو کو گلے لگا کر رونے لگے۔ ❁❁

قلم کار حضرات توجہ دیں

اپنی تخلیق کے ساتھ اپنا نام جو آپ کے بینک اکاؤنٹ میں ہے، انگریزی میں ضرور لکھیں، ساتھ ہی بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFSC Code بھی تحریر کریں۔

اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ بھی انگریزی میں تحریر کریں تا کہ آئندہ آپ کے معاوضے کی رقم سیدھے آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے اور آپ کو دشواری نہ ہو۔

اس اعلان کو خاص طور پر وہ سبھی قلم کار بھی نوٹ فرمالیں جن کا کسی بھی طرح کے لین دین کا تعلق بہار اردو اکادمی سے ہے۔

—— سکریٹری

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر اختر آزاد

House No. 38, Road No. 1, Azadnagar
Jamshedpur 832110 (Jhar.) (Mob. 09572683122)

سانپ سیڑھی

محبوب رہنما کی محبوبیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی اس لئے سب کے سب اُن کے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔

عمران بٹ بھی اُن کا دیوانہ تھا اور اُس نے بھی اُن کی محبوبیت کے در پر اپنا سر جھکا دیا تھا، جس کے باعث اُسے بھی پارٹی میں اچھی جگہ مل گئی تھی۔ پارٹی لائن پر چلتے ہوئے اُس نے نہایت ہی ایمانداری سے بے شمار کام کئے اور ایک دن اُسے ایسا لگا کہ آنے والے دنوں میں اُسے اس کا انعام ضرور ملے گا۔ کہیں نہ کہیں سے ٹکٹ کی صورت میں یا پھر کسی بڑے عہدے کے طور پر۔

ایماندار شخص آج کی سیاست کا حصہ نہیں ہو سکتا اور اگر ہوتا ہے تو نہ وہ سیاست کر سکتا ہے اور نہ ہی سیاسی داؤں پیچ سے پارٹی کو فائدہ ہی پہنچا سکتا ہے، لیکن اب پارٹی میں اُس کی اہمیت بڑھنے لگی تھی۔ محبوب رہنما براہِ راست اس سے فون پر اس علاقے کے مسائل پر رائے مشورے کرنے لگے تھے، اس لئے وہ مطمئن تھا کہ آنے والے انتخاب میں اُسے اس کی ایمانداری اور محنت کا پھل ضرور ملے گا، لیکن اس کی اس سوچ پر موسم نے اچانک گرہن لگا دیا تھا۔

بوڑھی ماں کو ایک سرد رات نے آغوش میں لے لیا تھا۔ اس دن سے والد صاحب کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی، اس لئے اس کا زیادہ وقت ان کی دیکھ بھال میں گزرنے لگا تھا۔

ایک بار پھر موسم نے انگڑائی لی اور بادلوں میں جگہ جگہ سلوٹیں پڑ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش نے ایسے تماشے دکھائے کہ جنت کو دوزخ میں بدلتے دیر نہیں لگی۔ والد صاحب کی طبیعت کچھ اور خراب ہو گئی۔ ایک ہفتے تک مسلسل بارش نے اپنا قہر ایسا برپا کیا کہ پورا علاقہ قبرستان میں تبدیل ہو گیا۔ ہر طرف ملبہ ہی ملبہ۔ لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

وقت رہتے جو لوگ اونچی جگہوں پر، پہاڑوں پر یا لاشوں کے ڈھیر پر چڑھنے میں کامیاب ہوئے تھے، وہی بچ گئے تھے۔ بچنے والوں میں ایک خوش قسمت عمران بٹ بھی تھا، لیکن یہ خوش قسمتی اپنے گھر کے پانچ افراد کو ایک ایک کر کے گھر سے بہتے ہوئے دیکھنے کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ وہ سبھی نچلی منزل میں تھے اور وہ والد صاحب کے ساتھ اوپری منزل میں۔ کچھ دیر قبل علاج کے لئے یہاں ڈاکٹر صاحب آئے تھے، لیکن جاتے وقت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کیا ہوا۔ اسے دیکھ کر عمران کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب تیز بارش میں آنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ کسی طرح والد صاحب کو ڈسپنسری لانے کے لئے کہہ رہے تھے۔ اپنی گاڑی اور ڈرائیور تک دینے کے لئے تیار تھے، لیکن خراب ہوتے ہوئے موسم میں گاڑی لے کر جانا اور انہیں سوار کر کے ڈاکٹر صاحب کے یہاں لانا اور پھر لے جانا موت کو دعوت دینے جیسا تھا، اس لئے اس نے ڈاکٹر کے پاؤں پکڑ لئے۔

''ڈاکٹر صاحب! ایسا ظلم نہیں کیجئے۔ ایسے موسم میں انہیں لانا ممکن نہیں ہے۔ جب میں گھر سے چلا تھا تو حالت بے حد نازک تھی۔ آپ چل کر انہیں دیکھ لیجئے۔ شاید آپ کے ہاتھوں کی تاثیر مجھے یتیمی کے دکھ سے بچا لے۔''

انہیں عمران بٹ پر ترس آ گیا اس لئے مجبوراً انہیں ان کے گھر جانا پڑا۔ گھر سے نکلتے وقت انہوں نے کہا تھا:

''عمران صاحب! آپ لیڈر کم سماجی کارکن زیادہ ہیں۔ اس لئے اتنے خراب موسم میں، میں آپ کے والد کو دیکھنے جا رہا ہوں، لیکن میرا دل اب بھی کہہ رہا ہے کہ اس موسم میں گھر سے نکلنا خطرے سے

PDF Compressor Free Version

خالی نہیں ہے، لیکن زندگی کا معاملہ ہے اس لئے..... لیکن اگر موسم کچھ اور خراب ہوا تو ہوسکتا ہے کہ مجھے آپ کے گھر ہی رُکنا پڑے۔ ٹھہرنے کا انتظام ہوجائے گا نا عمران صاحب.....؟''

''جی! آپ اس کی فکر نہ کریں۔ بس جلدی چلیں۔''

ڈاکٹر صاحب کو لے کر عمران بٹ اوپری منزل پہنچا۔ ڈاکٹر نے معائینے کے بعد کاغذ پر دوائیاں لکھ دیں اور ہدایت کی کہ جلد کسی میڈیکل شوپ سے جا کر دوا لے آئے۔ جب وہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر گھر آ رہا تھا تو اسے ایک بھی میڈیکل اسٹور کھلا نظر نہیں آیا تھا، اس لئے عمران بٹ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب اس وقت کوئی میڈیکل اسٹور.....؟''

''ارے بھائی! نہیں کھلا ہوگا تو میں کیا کروں.....؟''

''ڈاکٹر صاحب.....! اب تو جو کچھ کرنا ہے وہ آپ ہی کو کرنا ہے۔ ورنہ.....'' عمران بٹ کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ بہت منت سماجت کر کے وہ ڈاکٹر صاحب کو لایا تھا، لیکن بروقت دوا نہیں ملی تو پھر ڈاکٹر کے آنے نہ آنے کا کوئی مطلب نہیں تھا، اس لئے ایک بار پھر اس نے ہاتھ جوڑ لئے:

''ڈاکٹر صاحب! آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ شہر میں ایسا کون ہے جس نے گھر میں میڈیکل اسٹور کھول رکھا ہے۔ اگر والد محترم کو دوا نہیں ملی تو پھر ڈاکٹر صاحب..... کچھ کیجئے ڈاکٹر صاحب..... آپ ایسے بھی مریضوں کے لئے زمینی خدا ہیں اور خدا کے ہوتے ہوئے مریض دوا کے بغیر مرجائے تو سمجھئے کہ قیامت سر پر ہے۔''

عمران بٹ ایک بار پھر ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑانے لگا تھا۔

اسی وقت باہر زور سے بجلی گرجی۔ ڈاکٹر صاحب نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ والد صاحب پر ایک نظر ڈالی۔ دل ہی دل میں کچھ سوچا اور پھر اپنے ایک دوست کو فون کیا۔ مثبت جواب ملتے ہی وہ عمران بٹ کو لے کر ان کے گھر پہنچے۔ دوا دلوانے کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی اس خراب موسم میں وہ عمران بٹ کو چھوڑنے اس کے گھر تک آئے۔ اس وقت تک ایک دو پرائیوٹ گاڑیاں چل رہی تھی۔ پسنجر گاڑیوں کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔

موسم کچھ اور خراب ہوگیا۔

بارش کچھ اور تیز ہوگئی۔

ہواؤں کا تیز جھکڑ ایسا شور برپا کر رہا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ ایسے میں ڈاکٹر صاحب نے عمران کو دروازے پر چھوڑا تھا اور گاڑی موڑ کر اپنے گھر کا رخ کیا تھا۔ موسم خراب ہونے پر وہ رکنے والے تھے۔ عمران نے رکنے کے لئے کہا بھی تھا، لیکن اس وقت بیوی، بچے یاد آگئے اور وہ چاہ کر بھی نہیں رکے، لیکن جیسے ہی گاڑی موڑ کر ڈاکٹر صاحب اپنے گھر کی طرف بڑھے اور عمران بٹ سیڑھیوں سے ہوتا ہوا اوپری منزل تک پہنچا، بارش اچانک کچھ اور تیز ہوگئی تھی اور پھر اچانک ایسا شور برپا ہوا جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ نشیبی علاقوں میں ہاہا کار مچ گیا تھا اور پانچ منٹ کے اندر اندر پانی کے تیز بہاؤ میں ڈاکٹر صاحب کی وہ گاڑی اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہوتی ہوئی نشیب کی طرف جاتی دکھائی دی۔

عمران بٹ کی سانسیں ایک پل کے لئے رُک گئی تھیں۔ اُسے لگا کہ اُس کی خودغرضی نے ایک ڈاکٹر کی جان لے لی ہے۔ ابھی وہ سنبھلتا کہ اس سے پہلے ہی اس نے دیکھا کہ اچانک پانی نچلی منزل تک پہنچ آیا ہے اور دونوں منزل کے درمیان کا راستہ جو سیڑھیوں کی صورت میں نہ جانے کب سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا، وہ ایک زور دار آواز کے ساتھ الگ ہوگیا تھا اور بیوی اور چار بچے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے بہتے چلے جا رہے تھے۔

ماں کا غم ابھی تازہ ہی تھا۔ پندرہ دن بھی کیا دن ہوتے ہیں اور وہ بھی جب بھولنے والی شخصیت ماں ہو تو صدیاں کم پڑ جاتی ہیں۔

والد محترم کو اسی غم نے اندر سے چور چور کر دیا تھا۔ وہ ماں کو ایک پل بھی اپنے سے دور نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ قبرستان سے لوٹے تو پھر سنبھل نہیں پائے۔ پندرہ دنوں میں وہ نہایت کمزور ہوگئے تھے، حالاں کہ انہیں کوئی ایسی بیماری نہیں تھی۔ بس بڑھاپا ہی ایک بیماری تھی، لیکن اِدھر سانس لینے میں انہیں پریشانی ہونے لگی تھی اور دل کی دھڑکن میں بھی بے ترتیبی در آئی تھی۔ ایک دو دن ہسپتال میں

PDF Compressor Free Version

بھی رہے۔ دوائیاں چل رہی تھیں، لیکن موسم کی اچانک خرابی نے ان کی طبیعت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

شکر ہو اُس ڈاکٹر کا کہ ناموافق حالات میں نہ چاہتے ہوئے بھی گھر آئے اور یہیں سے جنت کا رخت سفر باندھا۔

پانی کچھ اور بڑھ رہا تھا۔

اب پانی کا بھوت نچلی منزل سے ہوتا ہوا اوپری منزل پر آ گیا تھا اور تیزی سے پلنگ کی اوپری سطح پر پاؤں پسارنے لگا تھا۔ عمران گھبرا گیا۔ فوراً والد صاحب کو کاندھے کے سہارے چھجے پر چڑھا دیا اور خود بھی چڑھ گیا۔ پانی دیکھتے ہی دیکھتے چھجے کی نچلی سطح کو چھونے لگا تھا۔ موت کو قریب پا کر اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ اب کوئی راستہ نہیں تھا کہ والد صاحب کو لے کر وہ بھاگ سکے۔ اوپر ٹین کے شیڈس تھے۔ چوبیس گھنٹے تک پانی چھجے کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ اس دوران والد صاحب کی طبیعت اور بھی نازک ہوتی چلی گئی تھی۔ یتیمی کا خوف اس کے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا اور وہ ہر لحہ اللہ سے دعائیں مانگ رہا تھا۔

پھر اُس کی یہ دعائیں اڑتالیس گھنٹے کے بعد اس طرح قبول ہوئیں کہ پورا مکان ڈھ گیا، اس سے پہلے کہ دونوں ملبے میں دب کر قصہ پارینہ بن جاتے، عمران والد کو بچا کر نکلنے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ پورا علاقہ قبرستان میں بدل چکا تھا۔ عمران بٹ کا گھر اونچائی پر تھا، اس لئے دونوں بچ گئے تھے، ورنہ ہزاروں لوگوں کی طرح دونوں لقمۂ اجل بن گئے ہوتے۔

جب تک عمران بٹ جان بچانے کی فکر میں تھا تب تک بیوی بچوں کا درد اتنا نہیں بڑھا تھا، لیکن جیسے ہی خود کو محفوظ سمجھنے لگا، چاروں بچے اور بیوی کا چہرہ پانی میں ہچکولے کھاتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ آنکھیں بھیگنے لگیں۔ زندگی اندھیرے میں ڈوبتی دکھائی دینے لگی، لیکن اس ڈوبتی زندگی کا واحد سہارا والد محترم خوش قسمتی سے زندہ تھے۔

لیکن قدرت کا کھیل دیکھئے کہ ناسازگار حالات میں جب والد صاحب کے بچنے کی اُمید کم سے کم ہوتی جا رہی تھی تو وہ بچ گئے، لیکن پھر وہاں سے شروع ہوئی انہیں نئے سرے سے بچانے کی جدوجہد۔

اس عالم پریشانی میں زندگی کے لئے جدوجہد کرنا کسی کے لئے بھی آسان نہیں ہوتا۔

ایسے روح شکن لمحات میں عمران بٹ والد صاحب کو کاندھے پر اُٹھائے گرتے پڑتے اونچی پہاڑی کی طرف بھاگا تھا۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا جب والد اس کے کاندھے سے پھسل کر ملبے سے الجھ گئے تھے۔ اُس وقت عمران کی تو جان ہی نکل گئی تھی، لیکن اسی اثناء، اللہ کا کرم اس کے بازوؤں میں سمٹ آیا تھا۔ تبھی وہ والد کو اس ملبے سے نکالنے اور اسی حالت میں دوبارہ کاندھے پر رکھنے میں کامیاب ہوا تھا۔ کچھ آگے جا کر اس نے ایک گڈھے کے جمع پانی سے ہاتھ منہ صاف کیا۔ سانسوں کی آمد و رفت پر نظر ڈالی۔ دل کی دھڑکن کو محسوس کیا۔ اس وقت عمران کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی، لیکن کپڑوں کے بھیگ جانے اور ملبے سے سنے ہونے کی وجہ سے والد صاحب کا جسم کچھ اور بھاری ہو گیا تھا۔ اس لئے انہیں لے کر چلنے میں کچھ پریشانی ہو رہی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ خوش تھا کہ اس آفت ناگہانی میں بھی والد محترم اس کے ساتھ تھے۔

کبھی عمران بٹ ان کے کاندھے پر ہوتا تھا، لیکن آج اس نے والد کو کاندھے پر اُٹھا رکھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کل جب ایسی مصیبت آئے گی اور وہ والد محترم کی عمر کو پہنچ جائے گا تو پھر اُسے کاندھے پر کون سوار کرے گا؟ کیوں کہ سوار کرنے والے دونوں بیٹے خود لہروں پر سوار ہو کر اتنی دور جا چکے تھے، جہاں سے لوٹنا ناممکن تھا۔

ایک ہفتہ تک اس ناگفتہ بہ حالات میں عمران بٹ نے پہاڑ کے اوپر ایک گھنے درخت کے نیچے گزارا۔ گھر سے بھاگتے وقت اس نے والد کے لئے جو بسکٹ، بریڈ اور کچھ فروٹس خریدے تھے اسے ساتھ لے لیا تھا۔ یہی اسباب چار دن تک والد محترم کے مردہ جسم میں سانس بھرنے کے کام آئے۔

پانچویں اور چھٹے دن ہیلی کاپٹر سے بریڈ اور پوری سبزی کا پیکٹ گرایا گیا۔ کسی طرح وہ دونوں دن ایک ایک پیکٹ لوٹنے میں کامیاب ہوا۔ پیکٹ کے اوپر لکھا تھا:

''حکومت کو آپ کی جان کی پرواہ ہے۔ ہزاروں فوجی حفاظت کے لئے لگا دیئے گئے ہیں۔ موسم سازگار ہوتے ہی دور دراز

PDF Compressor Free Version

علاقوں میں پھنسے لوگوں کو ہیلی کاپٹر سے نکال کر انہیں بہ حفاظت گھر تک پہنچایا جائے گا۔ اپیل ہے کہ ہمت سے کام لیں اور اس آفت ناگہانی کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔''

راحت اور بچاؤ کے کام میں فوج پوری طرح سے جٹی ہوئی تھی۔ کئی نے اپنی جان پر کھیل کر لوگوں کو بچایا تھا اور کئی نے بچانے میں اپنی جان تک گنوادی تھی۔ ملک کا ایک ایک فرد دعائیں مانگ رہا تھا۔ میڈیا کا رول بہت اہم تھا۔ ہیلپ لائنیں کھولی گئیں۔ امدادی فنڈ یکجا کرنے کے لئے کئی تنظیمیں سامنے آئیں۔ تجہیز وتکفین کے لئے کمیٹیاں بنائی گئیں۔ حکومت کی ساکھ بچی رہے، اس کے لئے مرنے والوں کی اچھی خاصی قیمت لگائی گئی۔ اس آفت سے مقابلہ کرنے کے لئے ملک کا ہر شخص اپنے اپنے طور پر کوشاں تھا۔ جن سے جو بن رہا تھا کر رہے تھے، لیکن آفت اتنی بڑی تھی کہ اُس سے فوری طور پر نپٹنا آسان نہیں تھا۔

اس آفت زدہ موسم میں والد محترم کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ عمران بٹ کو ڈر ستانے لگا تھا کہ کہیں ہیلی کاپٹر آنے سے پہلے وہ اس کا ساتھ نہ چھوڑ دیں۔ اب اس کے اندر اتنی طاقت نہیں بچی تھی کہ وہ والد کو کاندھے پر اُٹھا کر چل پاتا، لیکن اس سے پہلے کہ متاثرین کے لئے حکومت ہیلی کاپٹر بھیجتی، سیاسی کھیل شروع ہوگیا۔

انتخاب میں بس تین ماہ کا وقت تھا اس لئے ہر کوئی داؤں پیچ میں لگا ہوا تھا۔ ایسے میں متاثرین کو بچانے کے لئے ہر کوئی پہل کرنا چاہتا تھا، اپنے سر سہرا بندھوانا چاہتا تھا، اس لئے پارٹیاں بیان بازی پر اُتر آئی تھیں۔ خراب موسم اب بھی چنوتی بنا ہوا تھا، لیکن ایسے میں جب عمران بٹ کو معلوم ہوا کہ اس کے محبوب رہنما شعبۂ موسمیات کی رخنہ اندازی کے باوجود متاثرین کو بچانے آرہے ہیں تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ بار بار والد کے کانوں میں کہتا:

''ابا جان! میں نہ کہتا تھا کہ میرے محبوب رہنما سب سے ہٹ کے ہیں، وہ آرہے ہیں، آپ کو مرنے نہیں دیں گے۔''

اس کے بعد عمران اپنے ہاتھوں پر اپنے والد کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کرتا۔ آنکھیں اس طرح چھلکتیں جیسے وہ اس کے محبوب کا شکریہ ادا کر رہے ہوں۔ ایسے میں عمران اپنی خوشی نہیں روک پاتا۔ والد سے لپٹ جاتا۔ بند ہوتی پلکوں پر ہونٹ ثبت کر دیتا۔ فرط مسرت سے کہتا:

''اب آپ کو کچھ نہیں ہوگا ابا جان۔ بس کچھ دیر اور انتظار کریں، میرے محبوب رہنما آتے ہی ہوں گے۔''

وہ دل ہی دل میں اپنے محبوب رہنما کے اس جذبے کو سلام کر رہا تھا کہ کوئی ایسا ہے جو ضرورت پڑنے پر عوام کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا سکتا ہے اور پھر وہ تو اس پارٹی کا ایک ایسا رہنما تھا جس کی ایمانداری اور کام کی وجہ سے پارٹی میں اس کا قد کچھ اور بڑھ گیا تھا، لیکن ٹکٹ ملے گا یا نہیں اس کو لے کر سوال تھا، کیوں کہ اس کے پاس اتنے بھی پیسے نہیں تھے کہ وہ اپنے لئے ایک کار خریدتا اور اب جو کچھ تھا وہ بھی سیلاب کی نذر ہو چکا تھا۔ امیدوار کے پاس انتخاب میں اُلٹے سیدھے کاموں کے لئے بھی پیسے ہونے چاہئے۔ ٹکٹ ملے نہ ملے، لیکن اسے آج اپنے محبوب رہنما پر فخر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس لائق ہیں کہ اُٹھتے بیٹھتے سلام کیا جائے۔

کچھ ہی دیر میں اس کے محبوب رہنما پچاس ہیلی کاپٹر کے ساتھ پہنچنے والے تھے۔ مصیبت زدوں کو جہنم سے نکال کر محفوظ مقام پر لے جانے والے تھے۔ اس وقت عمران بٹ کے لاغر جسم میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ اس نے اپنے والد کو کاندھے پر، کبھی گود میں اور کبھی چادر کی گٹھری بنا کر رات کے اندھیرے میں پہاڑی ڈھلان پر ہزاروں فٹ کی اونچائی سے نیچے تک پہنچنے کی ضد ٹھان لی تھی۔ آخر کار اس کی ضد نے والد محترم کو نیچے تک اُتارنے میں اس کی مدد کی۔

جب وہ گرتے پڑتے ہیلی پیڈ تک پہنچا تو وہاں موجود پولس والے اس کی طرف دوڑے۔ سب سے پہلے چادر کی گٹھری کو کھول کر والد صاحب کو زمین پر لٹایا گیا۔ والد صاحب وہاں تک پہنچتے پہنچتے بے ہوش ہوگئے تھے۔ جسم میں تو پہلے بھی جان باقی نہیں رہی تھی، لیکن چادر میں بندھے بندھے وہ اور بھی پژمردہ ہوگئے تھے۔ پولس والے نے والد صاحب کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ وہ تھوڑا بہت سنبھلنے لگے تو عمران بٹ کی جان میں جان آئی، ورنہ اسے ایک لمحہ کے لئے ایسا لگا کہ کہیں وہ اپنی ہی لاش کو ڈھوتے ہوئے تو ہیلی پیڈ تک نہیں پہنچا تھا۔ پھر اس نے پولس والے سے بوتل لے کر والد صاحب کو تھوڑا پانی پلایا۔

PDF Compressor Free Version

دھیرے سے انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ خوشی کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی، پھر تھوڑا سا چنا اور پانی اپنے پیٹ میں اُتارا۔ نسوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی، لیکن جب لوگوں کی لمبی لائن دیکھی تو اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ وہ گھبرا گیا کہ اب کیا ہوگا.....؟

خبر ملتے ہی لوگ باگ یہاں رات سے ہی جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ بھیڑ اتنی تھی کہ اگر ہزاروں ہیلی کاپٹر بھی پہنچ جاتے تب بھی سبھوں کو بحفاظت نکال پانا مشکل تھا..... اس نے پولس والوں سے منت سماجت کی۔ ایک دو کے پیر پکڑے تو انہوں نے والد صاحب کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے اُسے سب سے آگے کھڑا کر دیا۔ لوگوں نے احتجاج کیا۔ بھیڑ میں آدھے سے زیادہ کی حالت نازک تھی اور سب یہی چاہتے تھے کہ انہیں سب سے پہلے اس سیلابی نرک سے نکالا جائے۔

عمران بٹ والد صاحب کو کاندھے پر اُٹھائے صبح سے ہی لائن میں اور وہ بھی سب سے آگے کھڑا تھا، اس لئے مطمئن تھا کہ اگر ایک بھی ہیلی کاپٹر مدد کے لئے یہاں پہنچا تو اُسے اُس میں جگہ مل جائے گی اور پھر وہ جلد سے جلد والد محترم کا علاج کروا سکے گا۔

اب دن کی سوئی کے چھوٹے بڑے دونوں کانٹے اپنی اپنی مسافت طے کر کے بارہ نمبر کے اوپر جمع ہوگئے تھے۔

ہیلی کاپٹر کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی..... پولس والے بھیڑ کو اُس طرف جانے سے روک رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ تاکید بھی کر رہے تھے کہ:

"اگر کسی نے لائن توڑ کر آگے آنے کی ہمت کی تو اُسے سب سے پیچھے کھڑا کر دیا جائے گا۔"

اس اعلان کے بعد بھیڑ میں کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی تھی۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ وہ پولس والوں کی نظروں میں آئے اور اُسے لائن کے آخر میں کھڑا ہونا پڑے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اس سرد موسم میں جیتے جی یہاں مر جائے گا..... لیکن اس کے باوجود ہر کسی کی خواہش یہی تھی کہ کسی طرح سے وہ لائن میں آگے پہنچ جائے۔

عمران بٹ لائن میں سب سے آگے تھا، اس لئے پہلے ہیلی کاپٹر میں جگہ ملنا طے تھا، مگر والد محترم کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر وہ لائن میں سب سے پیچھے بھی ہوتا تب بھی اُسے امید تھی کہ اس کے محبوب رہنما جب پرسان حال لوگوں کی خبر لینے کے لئے ہیلی کاپٹر سے اُتر کر بھیڑ سے ہوتے ہوئے والد محترم کے پاس پہنچتے تو اُسے آگے لے جانے کے لئے کہتے۔

وہ یوں تو اپنے محبوب رہنما سے پہلے بھی مل چکا تھا، اس لئے اندر سے خوش تھا۔ سوچا تھا کہ جیسے ہی وہ سامنے آئیں گے تو وہ انہیں پہچان لیں گے۔ اگر خستہ حالی کے باعث نہیں بھی پہچان پائے تو وہ انہیں بتائے گا کہ وہ عمران بٹ ہے، پارٹی کا ایک رکن، محلے میں کافی کام کیا ہے۔ ڈرائنگ روم میں اُن کی ہی قد آور تصویریں ہیں۔ دن رات وہ پارٹی کے مستقبل کے لئے دعائیں کرتا ہے کہ آنے والے انتخاب میں ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں ہو، تاکہ ترقی کا گراف اس تیزی سے اوپر اُٹھے کہ پانچ سال میں روپیہ، ڈالر کے برابر کھڑا ہو کر اُسے للکار سکے۔

سوچ کا کارواں بڑھتا رہا۔

ہیلی کاپٹر ایک کے بعد ایک اُترتے اور اُڑتے رہے۔

سب سے پہلے محبوب رہنما کا ہیلی کاپٹر اُترا اور سب سے آخر تک ہیلی پیڈ پر موجود رہا۔

شام کے سورج کے ساتھ والد صاحب کی نبض بھی ڈوب رہی تھی۔ محبوب رہنما جیسے ہی بھیڑ کے قریب پہنچے۔ نعرے بازی شروع ہوگئی۔ دھکا کمی بھی ہونے لگی۔ عمران بٹ والد صاحب کو کاندھے پر لئے دھکے پر دھکے کھاتا رہا اور ہر دھکے کے بعد پیچھے اور پیچھے ہوتا رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ پاگلوں کی طرح آگے آنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن ہر بار اُس سے کچھ پوچھنے کے بعد پیچھے ڈھکیل دیا جاتا رہا۔

اور ایک بار پھر وہ سب سے پیچھے ہوگیا۔

اس کے محبوب رہنما بھیڑ میں آئے بھی۔ اس سے ملے بھی۔ اُس نے والد صاحب کی حالت بھی بتائی۔ رویا اور پاؤں پکڑ کر گڑگڑایا بھی۔ ان کے قدموں پر والد محترم کو رکھ کر پاگلوں کی طرح چلایا بھی، لیکن اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پاؤں چھڑا کر جب وہ آگے بڑھ رہے تھے، تبھی والد محترم زور زور سے ہچکی لینے لگے تھے۔ پولس والے دوڑ کر ان کے پاس آگئے۔

(بقیہ ص ۴۷ پر)

PDF Compressor Free Version

ابرار مجیب

318, Sanivani, Sunderban Phase-2 Pardih, Mango,
Jamshedpur 831020 (Jharkhand)

نیل کنٹھ کی واپسی

خزاں کا موسم درختوں کی زرد پتیوں پر بیٹھا تھا۔ معمول کے مطابق وہ شوہر کے ساتھ سناٹے میں ٹہل رہی تھی۔ کبھی اوپر درختوں کی بلندی کو دیکھتی اور کبھی دور دور تک پھیلے ویرانے کو۔ گھر سے نکلنے کو ہوتی تو شوہر ہمیشہ منھ بناتا، ایک اندرونی بے چینی کا شکار ہو جاتا، اسے یہ سب فضول لگتا، لیکن وہ اسے اکیلا چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ساتھ لے کر نکلنا ہی پڑتا۔ وہ کبھی ہوا میں گرتے ہوئے پتے کو دیکھتی اور کھڑی ہو جاتی، شوہر مڑ کر دیکھتا اور ایک لمبی ہنکار بھرتا۔ چہرے پر ہلکے غصے کا تاثر ابھرتا اور اسے پکارنے لگتا۔ وہ دھیان نہیں دیتی، پتہ جب زمین سے ٹکراتا تو وہ اسے بہت غور سے دیکھتی، جھک کر اٹھا لیتی، پیلا پتہ جس پر کتھئی چکتے پڑے ہوتے، ناک کے قریب لاتی، زور سے سونگھتی اور شوہر کو دیکھتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔

آج ٹہلتے ٹہلتے بہت دور نکل آئی، گھنے پیڑوں کا جھنڈ پیچھے رہ گیا، چھدری جھاڑیوں اور چھوٹی چھوٹی ابھری ہوئی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیچے آبادی بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ شام کا سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا اور نیچے ڈھلان میں ذرا فاصلے پر ایک مندر کا کلس سورج کی الوداعی کرنوں میں جھلملا رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے پتھر کے ٹکڑے پر بیٹھ گئی اور جھلملاتے کلس کو دیکھنے لگی۔ شوہر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا:

''کیا ہوا؟ آؤ واپس چلیں۔'' وہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے جھلملاتے کلس کو دیکھتی رہی، پھر اس کی نگاہیں پھسل کر مندر کی دیواروں پر بنی دیوی دیوتا کی تصویروں پر رینگنے لگیں۔ نیلے شنکر کی تصویر، جس کے گلے سے سانپ لپٹا تھا، جس کی جٹاؤں کی چوٹی پر گنگا اپنے منھ سے پانی کی دھار نکال رہی تھی، جس نے کمر سے لے کر گھٹنوں تک شیر کی کھال پہن رکھی تھی۔ جس کی آنکھیں بند تھیں، لیکن ان بند آنکھوں سے بھی ایک مبہوت کر دینے والے اسرار کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اسے لگا وہ اس روشنی میں بھیگ رہی ہے۔ کیسی روشنی ہے یہ، شاید معرفت کی، گیان کی، اس نے ایک گہری سانس لی۔ ایک خیال، اندھیرے کا خیال اس کے ذہن میں بیدار ہوا، اس مندر کے گربھ گرہ میں اندھیرا ہوگا اور اس اندھیرے میں روشنی کا ایک ہالہ، شیولنگ کے گرد، اس کے اندر خواہش نے کروٹ لی، بہت تیز کہ وہ اس نیم تاریک گربھ گرہ میں بالکل تنہا ہو اور روشنی کے ہالے میں چمکتے شیولنگ کو دیکھتی رہے۔

''میں نے کہا چلو، واپس چلتے ہیں۔''

اس نے سر اٹھایا، شوہر کھڑا کچھ کہہ رہا تھا۔

''اس مندر کے گربھ گرہ میں اندھیرا ہوگا نا؟'' اس نے شوہر کی طرف دیکھے بغیر جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

''اندھیرا ہو رہا ہے۔ آؤ واپس چلتے ہیں۔'' شوہر اندر ہی اندر غصے میں سلگ رہا تھا۔

تب اس نے سر اٹھایا، دور پھیلی آبادی، سڑکوں پر روشنی جگمگا رہی تھی۔ دوسری طرف، درختوں کا جھنڈ پرچھائیوں میں بدل گیا، ہوا جیسے دھیمے سرسرا رہی تھی۔ اس میں خزاں کی مہک تھی، ایک اداس مہک، اسے یہ مہک پسند تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ جب درختوں کے جھنڈ سے گزری تو قدموں تلے خزاں رسیدہ پتے چرمرانے لگے۔ اوپر درختوں پر بیٹھے پرندوں میں کچھ ہلچل سی ہوئی۔ کوئی مینا زور سے چیخی۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا اور آپ ہی آپ اس کے ہونٹوں پر جیسے بے خیالی میں مسکراہٹ کی پتلی سی لکیر کھنچ گئی۔ پیچھے سے

PDF Compressor Free Version

آتے ہوئے شوہر نے اسے پکارا۔ ''سنو۔'' وہ چلتی رہی۔ شوہر تیز تیز چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

''ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی۔'' شوہر غصے میں بولا۔

''سنتی بھی نہیں ہو۔''

''سن رہی ہوں۔'' وہ اپنی رفتار سے چلتے چلتے بولی۔

''کیا سن رہی ہو؟''

وہ رک گئی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے زور سے سانس اندر کھینچی۔

''سب کچھ، سب کچھ سن رہی ہوں۔'' وہ آنکھیں کھول کر بولی۔ شوہر نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ دل میں غصے اور شاید نفرت کی ہلکی ہلکی تپش تھی۔ ''عورت ایسی ہوتی ہے؟'' اس نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔ گھر پہنچ کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ شوہر صوفے پر آنکھیں بند کیے کچھ سوچنے لگا۔ بہت دیر ہوگئی۔

''تم ساری زندگی میرے پیچھے پیچھے، غصہ میں جلتے ہوئے، گالیاں دیتے ہوئے، ہانپتے ہوئے بھاگتے رہو گے۔''

اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ سامنے کھڑی تھی، تولیے میں اپنے بالوں کو لپیٹے۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی، پھر وہ رکی نہیں، کچن کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔ ''چائے پیو گے؟''

''کیا کہا تم نے؟'' وہ کچن کے اندر آ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''کچھ نہیں، چائے پیو گے؟''

اسٹوو پر چائے کا برتن چڑھاتے ہوئے اس نے پھر پوچھا۔

''کیا کہا تم نے؟'' وہ لگ بھگ چیخ پڑا۔

''میں منافق نہیں ہوں۔''

''مطلب؟''

''مطلب، مطلب مجھے بھی معلوم نہیں۔'' اس نے چائے کی پتی کے دو بڑے چمچ برتن میں ڈالے، پھر دودھ۔ تھوڑی دیر میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ جیسے ہانپنے لگا۔

''تم.....تم.....''

''ہاں میں، کہو، پاگل، گالی بھی دو۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس کے اندر کا لاوا پھٹ پڑا۔ بہت گندی گالی دی اس نے اور کچن سے باہر نکل آیا۔ یہ روز کا معمول تھا۔

کمرے کے نیم اندھیرے میں وہ کھڑکی کی طرف منہ کیے پڑی تھی۔ سونے سے پہلے وہ کھڑکی کھول دیتی تھی، کھڑکی کے سامنے فرنٹ گارڈن میں اس نے رات کی رانی کا پودا لگوایا تھا اور اب اس میں بے شمار پھول آتے تھے۔ رات میں کھڑکی کھولتے ہی ہوا کے جھونکے کے ساتھ کمرہ مہک اٹھتا اور وہ ٹھہر ٹھہر کر گہری سانسیں لیتی۔ شوہر نے کروٹ بدل کر اس کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا اور ہولے سے اپنی طرف کھینچا۔

''تم جانتی تو ہو میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں، اس محبت میں کتنا ڈر گھل گیا ہے۔'' وہ پھسپھسایا۔

''تمہارے ڈر کا پتہ ہے مجھے، تمہاری محبت کا بھی، اس بہت بھاری، بے پناہ محبت کا۔'' وہ ویسے ہی لیٹے لیٹے بولی۔

''تم ویسی ہی کیوں نہیں ہو۔ ایک عورت، میری ماں کی طرح۔'' اس نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

''میں عورت نہیں ہوں۔''

''عورت نہیں ہو، یہی ہیں پاگل پن کی باتیں۔ عورت نہیں ہو، پھر کیا ہو؟'' اس کے اندر غصے کا ناگ سر ابھارنے لگا۔

''میں نہیں جانتی، میں شاید لاش ہوں، میں شاید مر چکی ہوں۔ شاید تمہارے اس بھاری بھرکم، بے پناہ محبت نے مجھے مار ڈالا ہے۔ جانتے ہو، تم جیسی بے پناہ، بہت بھاری محبت زندہ وجود کو مردے میں بدل دیتی ہے، مار ڈالتی ہے۔ مجھے تمہاری شدید محبت نے مار ڈالا ہے۔'' وہ کراہی۔ وہ کچھ دیر تک یوں ہی پڑا رہا پھر غصے میں کروٹ بدل کر نیم اندھیرے میں خالی دیوار کو گھورنے لگا۔

صبح کسی کھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی۔ باہر سے تالا لگانے کی آواز۔ وہ روز تالا لگا کر جاتا تھا۔ شوہر آفس جا رہا ہے، اس نے سوچا، کچھ دیر یوں ہی پڑی رہی، پھر بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شوہر کے جانے کے بعد اسے محسوس ہوتا جیسے لامتناہی سمندر کے اوپر وہ کسی سمندری پرندے کی طرح اڑ رہی ہے، کہیں کوئی رکاوٹ نہیں، بالکل آزاد، اپنے آپ سے ملتی ہوئی۔ جب تک وہ گھر میں ہوتا، اسے لگتا جیسے وہ سمندر کے بیچ ایک ویران جزیرے میں قید ہے۔ کبھی کبھی سامنے سڑک سے کسی لاری، کار،

PDF Compressor Free Version

موٹر سائیکل یا لوگوں کے گزرنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ یہ آوازیں بھی ایسی لگتیں جیسے سمندر کی بے ہنگم موجوں کا شور ہو، تالا لگا کر جاتے ہی اس کے اندر ایک توانائی، زندگی کی رمق پیدا ہو جاتی، جیسے برسوں کی قید سے اچانک نجات مل گئی ہو۔ بند گھر اسے اتنا وسیع و عریض نظر آنے لگتا جیسے اس گھر کے اندر ساری دنیا سما گئی ہو۔

ناشتہ کر کے اس نے الماری سے ابھی گیان شکنتلم نکالی اور پڑھنے لگی۔

جنگل کی ہریالی، دوڑتے ہوئے ہرن کے پیچھے پیچھے دشینت، رشی کا آشرم اور حسین شکنتلا کا دیدار..... اس نے کتاب ایک طرف رکھی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اندھیرا، وہی گہرا گہرا اور روشنی کے ہالے میں چمکتا ہوا سیاہ شیولنگ..... پھر ننگوں بدن والے شیوا کا چہرہ ابھرا جس کے گلے میں سانپ لہرا رہا ہے اور جٹاؤں سے گنگا کی دھار بہہ رہی ہے۔ سفید دودھیا پانی، وہ بھیگنے لگی، پھر پانی کی بوندوں میں اسے سورج نظر آیا، ہزاروں ننھے ننھے سورج روشن ہو گئے اس کی آنکھوں کے آگے۔ اسے یاد آیا، ایک بار شام کو معمول کے مطابق ٹہلتے ہوئے اس نے شوہر سے پوچھا تھا:

''تم بنارس گئے ہو کبھی؟''

''ہاں گیا ہوں، کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، میں بھی بنارس کے گھاٹ پر رات کے سناٹے میں جانا چاہتی ہوں۔''

''رات کے سناٹے میں.....؟''

''ہاں، رات کا سناٹا، اندھیرا، ہوا بہت ہلکی ہلکی بہہ رہی ہو اور..... اور پانی کی سطح پر ہزاروں، لاکھوں دیپ جگمگا رہے ہوں۔''

''پھر.....'' اس کا شوہر اسے اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس پر کسی قسم کا دورہ پڑنے والا ہو، وہ گھبرا سا گیا۔

''پھر..... پھر کوئی دیپ بہتا ہوا آئے اور میری ساڑی میں آگ لگا دے اور میں جل کر مر جاؤں۔'' اس نے بہت غصیلی آواز میں کہا، اس طرح جیسے شوہر نے اسے چوٹ پہنچائی ہو، وہ بیوقوف ہو، وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اسے سمجھ نہیں پا رہا ہو۔

''جانتی ہو'' شوہر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ''بنارس کے گھاٹ کا ایک سین فلم 'رام تیری گنگا میلی' میں بھی تھا۔''

''اچھا پھر؟''

''ارے، اس میں مندا کنی تھی نا۔''

اس نے خوشدلی سے بائیں آنکھ دبا کر کہا تھا۔ شوہر کے اس بھونڈے پن نے اس کے اندر غصہ کی ایک لہر دوڑا دی تھی اور وہ وقت سے پہلے ہی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گھر لوٹ آئی تھی۔

موبائل کی رنگ ٹون نے اسے اپنے خیالوں سے آزاد کر دیا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا، شوہر کی کال تھی، اس نے فون کاٹ دیا اور لیپ ٹاپ آن کر کے بیٹھ گئی۔ بے خیالی میں اس نے انٹرنیٹ ایکسپلورر کو کلک کر دیا، اچانک اسے خیال آیا کہ انٹرنیٹ موبائل مورڈم تو شوہر ہمیشہ لے کر چلا جاتا ہے اور جب واپس آتا ہے تو اپنے سامنے اسے نیٹ سرف کرنے کے لیے کہتا ہے۔ اس نے جھنجھلا کر لیپ ٹاپ آف کر دیا۔ موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ شوہر ہی کی کال تھی۔

''کیا ہے؟'' وہ تیز لہجہ میں بولی۔

''کیا کر رہی ہو؟'' شوہر نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے موبائل سوئچ آف کر دیا۔

شام کو شوہر واپس آیا تو اس کے چہرے پر ناراضگی تھی۔ آتے ہی اس نے غصے میں پوچھا: ''فون سوئچ آف کیوں کیا۔''

اس نے انجان نظروں سے شوہر کو دیکھا، کوئی جواب نہیں دیا۔ شوہر نے بھی مزید نہیں کریدا۔ اس نے اس کا موبائل اٹھایا اور اسے آن کر کے دیکھنے لگا۔ آخری کال اسی کی تھی۔ موبائل کو میز پر رکھ کر وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

''چلنا ہے؟'' شوہر نے تیار ہو کر پوچھا۔

''نہیں۔''

''کیوں کیا ہوا، چلو بھی۔''

''آج دل نہیں ہے ٹہلنے کا۔''

اس نے اتنا کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ شوہر اسے دیکھتا رہا۔ وہ بھی اس کے ساتھ نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ وہ کھڑی ہوئی سڑک کی طرف

PDF Compressor Free Version

دیکھ رہی تھی۔ سڑک کے اس پار میدان میں کچھ لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے اور سورج دور آسمان میں مغرب کے آخری چھور پر پہنچ کر ہانپ رہا تھا۔ وہ خاموش کھڑی ڈھلتے سورج کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ شوہر کھڑا کھڑا اکتاہٹ کا شکار ہونے لگا۔

''چلو اندر۔'' شوہر نے اس کے کاندھے کو آہستہ سے ہلاتے ہوئے کہا۔

''اندر۔'' جیسے بے خیالی میں اس نے کہا۔ وہ اب بھی ڈوبتے سورج کے پھولتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں۔ یہ کھڑکی کھڑی کیا دیکھ رہی ہو۔''

''یاد ہے اس روز کیا ہوا تھا؟'' وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''یاد ہے، اب تم زلزلے کی بات دوہراؤ گی۔''

''ہاں زلزلہ، دن میں زلزلہ آیا تھا اور دروازے پر تالا پڑا تھا۔ میں اکیلی کمرے میں، در و دیوار کانپ رہے تھے، پوری دنیا کانپ رہی تھی۔''

''ٹھیک ہے، مجھے معلوم ہے، چلو اندر چلو۔''

وہ مضطرب ہو کر بولا۔ ''نہیں۔''

''دیکھو، تم جانتی ہو، میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں، لیکن تم.....''

''جانتی ہوں۔ تم یم دوت ہو۔'' وہ تیزی سے اندر آ گئی۔

شوہر نے کمرے کی لائٹ جلادی اور ٹی وی کا ریموٹ لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''چلو، چلتے ہیں۔'' وہ شوہر کے سامنے آ کر بولی۔

''اس وقت۔ اب تو اندھیرا ہو رہا ہے۔''

''چلو۔'' وہ ویسے ہی کھڑی رہی۔

شوہر نے ریموٹ ایک طرف رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات تھے اور اندر ہی اندر غصہ کی ایک لہر بھی ابھر رہی تھی۔

وہ خاموشی سے چلتے ہوئے گھنے پیڑوں کے جھنڈ تک پہنچ گئے۔ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پیڑوں پر پرندوں نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ہوا بہت تیز تھی اور اس تیز ہوا میں پتے اڑ اڑ کر ان کے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔ جب وہ پہاڑیوں کے پاس پہنچے تو رات نے اپنا آنچل پسار دیا تھا۔ مندر کے گرد ملگجا اندھیرا تھا، اس کے چاروں طرف ٹمٹماتی ہوئی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ پتھر پر بیٹھ کر غور سے مندر کو دیکھنے لگی۔ شوہر بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔

نیل کنٹھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے اندر بے چینی سر ابھارنے لگی۔ ہر طرف خاموشی تھی اور ہوا سائیں سائیں بہہ رہی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں مندر کی دیواروں پر رینگتے ہوئے سائے تھے۔

''چلو'' اچانک وہ جھٹکے سے اٹھی اور چل پڑی۔ شوہر نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا، پھر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

رات میں وہ اسی طرح لیٹی تھی۔ کھلی کھڑکی سے رات کی رانی کی خوشبو کمرے کو مہکا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ شوہر کے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔ آج جب شوہر نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھا تو وہ اس کی طرف گھوم کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی تھی اور ہولے سے مسکرائی بھی تھی۔ اب شوہر سو رہا تھا، گہری نیند اور وہ جاگ رہی تھی آنکھیں بند کیے۔ وہ دیکھ رہی تھی گھنے اندھیرے سے ایک دودھیا روشنی پھوٹی، اس روشنی میں شنکر کا چہرہ تھا۔ نیل کنٹھ کے گلے میں لہراتا ہوا سانپ اور جٹاؤں سے بہتی گنگا کی دھار..... وہ شنکر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے چھو لینا چاہتی تھی۔ اس سانپ کی مالا کو اپنے گلے میں ڈال لینا چاہتی تھی۔ گنگا کی دھار سے اپنے ہونٹ لگا دینا چاہتی تھی، لیکن اچانک چاروں طرف دھند چھا گئی۔ اس دھند میں بجلیاں چمک رہی تھیں، پھر جیسے بادل گرجنے لگے..... تیز ہواؤں کا شور۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی، کھلی کھڑکی سے بارش کی چھینٹیں ہوا کے جھونکے کے ساتھ اندر آ رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی آئی۔ باہر اسٹریٹ لائٹ میں بارش کی پھواریں نظر آئیں۔ اس نے کھڑکی کے راڈ سے اپنا ایک ہاتھ باہر نکالا اور بارش کی پھوار کا لمس محسوس کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور گرتی ہوئی پھواروں سے اس کا ہاتھ بھیگ رہا تھا۔ اچانک کمرے میں روشنی ہو گئی۔ شوہر سوئچ کے پاس کھڑا نظریں ادھر اُدھر گھما رہا تھا۔ روشنی ہونے کے باوجود وہ آنکھیں بند کیے کھڑکی سے لگی کھڑی رہی۔ شوہر اس کے قریب آ گیا:

''کیا کر رہی ہو یہاں؟''

PDF Compressor Free Version

اس نے آنکھیں کھولیں اور اجنبی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔ ''بارش ہو رہی ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''اچھا، پھر.....'' شوہر کی آواز میں ایک لاتعلقی تھی۔

''کچھ نہیں، تم سو جاؤ۔ تم نہیں سمجھو گے۔''

''کیا سمجھنا ہے، چلو سو جاؤ۔''

شوہر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

''یم دوت!'' وہ بدبدائی اور اپنا ہاتھ چھڑا کر بستر پر بیٹھ گئی۔

شوہر دوبارہ آ کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر وہ بیٹھی رہی، پھر اٹھ کر کتابوں کی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں سے اس نے ایک ڈائری نکالی اور میز کی دراز سے قلم نکال کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ شوہر اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ٹیبل لیمپ جلا کر وہ لکھنے لگی۔

''تم جانتے ہو، زہر کیا ہے۔''

اچانک اس نے سر اٹھا کر شوہر سے پوچھا۔

''کیا، زہر!.....تم.....''

''شنکر نے زہر پیا تھا، اس کا کنٹھ نیلا ہو گیا تھا، پتہ ہے نا۔''

''پتہ ہے۔'' شوہر خود کو بیوقوف محسوس کر رہا تھا۔

''شنکر مرا نہیں، ہے نا!''

''وہ بھگوان تھے۔'' شوہر کو پریشانی محسوس ہو رہی تھی۔

''شنکر کبھی نہیں مرتا، سمجھے۔'' وہ تیز لہجہ میں بولی۔

شوہر نے اسے سخت نظروں سے دیکھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ ایک بار پھر وہ ڈائری پر جھک گئی اور اس کا قلم تیزی سے چلنے لگا۔ وہ ایک نظم لکھ رہی تھی۔ جب نظم مکمل ہو گئی تو اس نے کاغذ کی پیشانی پر ایک عنوان لکھا۔ ''نیل کنٹھ کی واپسی۔'' شوہر نے جھک کر نظم پڑھی، عنوان دیکھا اور گہری سانس لے کر بیڈ پر آ گیا۔

شام میں جب شوہر واپس آیا تو دروازے پر تالا نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ میز پر ڈائری کھلی پڑی تھی۔ وہ گھر میں نہیں تھی۔ شوہر نے ڈائری اٹھا کر دیکھی، ڈائری کا وہ ورق غائب تھا جس پر اس نے نظم لکھی تھی۔ ''نیل کنٹھ کی واپسی۔''

وہ بیڈ پر گھٹنوں میں سر دئے بیٹھا تھا۔ کمرے میں گھنا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اسے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ اٹھ کر لائٹ آن کر دے۔ وہ بالکل ساکت تھا، بدن میں کوئی حرکت نہیں جیسے وہ بے جان ہو۔ دفعتاً باہر کسی کار کے رکنے کی آواز آئی۔ اس کے بدن میں حرکت ہوئی اور اس نے ہولے سے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ ابھی تک یوں ہی کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک سایہ دروازے کے پاس آ کر ٹھٹھک گیا۔

''آ گئی، کہاں گئی تھی۔'' وہ پلنگ سے اتر کر بولا۔

''میں ہوں، ڈاکٹر چٹرجی۔'' سایہ کمرے میں آ گیا اور سوئچ بورڈ کر سوئچ آن کر دیا۔ کمرہ روشن ہو گیا۔

''ڈاکٹر، وہ چلی گئی۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہے، لیکن تم کو آج میرے پاس آنا تھا۔'' ڈاکٹر نے ملائم لہجہ میں کہا۔

''وہ تالا.....''

''تالا!'' ڈاکٹر مسکرایا۔

''تالا نہیں تھا دروازے پر، ہے نا۔''

''ہاں۔'' اس کے لہجہ میں بے چینی تھی۔

''ٹھیک ہے، تالا ادھر ہے۔ وہ دیکھو۔'' ڈاکٹر نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''دیکھو اس میں چابی بھی لگی ہوئی ہے۔''

وہ کچھ نہ بولا خاموش ہو گیا۔

''نیل کنٹھ واپس آ گیا ڈاکٹر۔''

ڈاکٹر نے کچھ نہیں کہا۔ بیگ سے ایک دوا نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ کھالو، میں پانی لاتا ہوں۔''

ڈاکٹر پانی لے کر آیا، اسے نے دوا کھالی۔

''اچھا، میں دوائیں یہاں رکھ کر جاتا ہوں۔ روز ٹائم پر لے لینا، اور ہاں کل سے آفس جاتے ہوئے تالا ٹھیک سے لگا لینا۔''

ڈاکٹر چلا گیا تو اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

شہیرہ مسرور

4B, St. Georges Gate Road, Hastings Kolkata 700022 (Mob. 9339280328)

چاندنی

کبھی کبھی میری تنہائی یادوں کی ایک نوک لے کر مجھے چھوتی ہے اور میں یاد کو تھامے چل پڑتی ہوں۔ خلیل بھائی کو ہمارے یہاں آفتاب علی لے آئے تھے۔ اماں بیٹھی سپاریاں کاٹ رہی تھیں۔ سلام، دعا درود، خیریت یعنی ابتدائی گفتگو ختم ہوئی تو کہا:

''اماں جی یہ لڑکا ہمارے گاؤں کا ہے، میں اسے آپ کے پاس لے آیا ہوں، گیرج میں کام کی خاطر۔ آئے ہفتہ بھی نہیں گزرا، اب یہ کہہ کر مجھے پریشان کئے جارہا ہے کہ میں یہاں کام کرنے ضرور آیا ہوں، لیکن گیرج میں کام کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔''

''کیوں؟'' اماں نے پوچھا۔

''اب میں کیا بتاؤں..... آپ شاید جانتی ہیں گیرج میں ٹیمپو لے کر آنے والے ڈرائیور، ہم ان کی ٹیمپو کی مرمت کرتے ہیں اور وہ اپنی مرمت آپ کرتے ہیں، پی پا کر ایک دم مستی میں اور یہ خلیل.....''

''نشہ کرنے والوں کی صحبت بھلے آدمی کو راس نہیں آتی، لیکن ہم اسے رکھ لیں تو مشکل ہے کہ وہ تنخواہ جو آپ.....''

''نہیں نہیں، وہ آپ اپنے حساب سے دیں.....''

''آفتاب علی چلے گئے، خلیل بھائی رہ گیا تو، آہستہ آہستہ نہیں، بہت جلدی ہمارے ماحول میں سما گیا۔ ہماری بک بائنڈنگ کی دکان تھی، خلیل بھائی اس میں ہماری مدد کرنے لگا۔ دن اچھی طرح کٹنے لگے، اردگرد رہنے والے لوگ اگر راس آجاتے ہیں تو دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ خلیل بھائی بھی جلدی بڑا ہوگیا اور ہم تو عمر میں اس سے چھوٹے تھے۔ ساتھ ساتھ ہم بھی کچھ بڑے ہوگئے۔ پہلے ہم بھائی بہنوں میں وہ صرف خلیل کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ڈھیر ساری چھوٹی باتوں میں ایک بات ہے کام کرنا۔ ایک طرح سے اچھی بات سہی، لیکن کبھی کبھی یہ کسی کو ادھیڑنے میں دیر نہیں کرتی۔ ماں نے ایک دن کہا:

''تم لوگ کبھی کبھی کسی بات سے اپنے آپ کو چھوٹا کر لیتے ہو۔ وہ مجھے اماں جی کہتا ہے اس لئے میں اسے خلیل کہہ کر بلاتی ہوں۔ اسے تم کم از کم خلیل بھائی کہہ سکتے ہو۔ عمر میں بڑا ہونا بھی بڑی بات کا ایک حصہ ہے۔''

ایک دن خلیل بھائی گاؤں سے آیا، ڈھیر سارا نمک پارہ، ناریل کی ڈھیر ساری برفیاں اور ریوڑیاں لئے۔ ماں کو دیتے ہوئے کہا:

''اماں جی آپ لوگوں کے لئے لایا ہوں۔''

''کیوں یہ تکلیف کی تم نے، پہلے تو کبھی بھی نہ لائے اس طرح''

''شادی ہوئی ہے نا۔''

دھیمی آواز میں کہا، پھر مجھ سے کہنے لگا:

''تمہاری بھابی نے تم لوگوں کے لئے نمک پارہ اور ناریل کی برفیاں بنائیں۔ صرف ریوڑیاں دکان کی ہیں۔''

''بھابی؟..... یہ کیا کیا تم نے، اب تو کلکتہ میں زیادہ دن ٹھہرنے سے رہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم، شادی کرنے والے لوگ کیا نوکری چھوڑ کر گاؤں بھاگ جاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے دیکھا جائے گا، نام کیا ہے بھابی کا؟''

''چاندنی''

''چاندنی' میں نے جان بوجھ کر بلند آواز میں خلیل بھائی ہنستے ہوئے دکان کو چلا گیا۔ اب تو یوں دن گزرتے کہ باتیں کرتے ہوئے خلیل بھائی تنہا نہ ہوتے، چاندنی بھابی بھی ہوتی، غائبانہ۔''

بقرعید کی تیاریاں بہت پہلے سے کی جاتی ہیں۔ چھریوں کو

سان دلایا، چٹائیاں دھلوائیں، بڑی بڑی ہانڈیوں کو مانجھ کران کے تلے مٹی سے لیپ دیے گئے۔ اصل تیاری یہ کہ ماں ہمیں ساتھ لے کر مسالوں کو دھوتی، سکھاتی، کوٹنے کے لئے ہاون دستے نکالے جاتے۔ یہی تھی عید کی رونق۔ خلیل بھائی بیٹھے مسالہ کوٹتے اور مسالہ کوٹتے کوٹتے زبان ایک اچھی رفتار پکڑ لیتی:

”جانتی ہیں اماں جی یہ بہویں ہوتی ہیں نا۔ ان کو آپ کسی کام کے لئے کہیں تو کہیں گی ہم سے یہ کیا نہیں جاتا، مسالہ کوٹا نہیں جاتا۔ سحری کے وقت دیر سے اٹھیں گی، اذان ہو چکی ہے، چائے پیتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔ کچھ نہیں ہوگا، پیٹ بھر کر کھانا تو نہیں کھا رہی ہوں، مغرب کی اذان سے پہلے نماز پڑھ چکی ہیں، کیوں فلم شروع ہو جائے گی نا۔ ویسے گاؤں میں بھی یہی قصہ ہے۔ ٹیوب ویل کے پاس ہوتا ہے گاؤں کی گوریوں کا ہنسنا بول۔ پانی بھرنے سے پہلے اپنی اپنی پریشانیاں ظاہر کرنے لگیں گی کہ کس کی ساس کیا کہتی ہے، اس کا جواب کیا دیا جائے۔ کس کے بابو کا پیٹ خراب ہے، دوا کون سی لینی ہے، سب سے بڑی بات یہ کہ کسی کا مرد بہت دیر سے گھر آئے تا نک جھانک کر، بجھ رہی ہوتا، پھر تو ایک کہے گی وہ مولوی صاحب ہیں نا ان کی تعویز میں بہت اثر ہوتا ہے۔“

میری طرف خلیل بھائی اپنا چہرہ بڑھا کر آہستہ آہستہ کہنے لگے:

”چاندنی ایسی باتوں میں بالکل نہیں رہتی۔ ہر کام میں تیزی، ہر بات میں نیک ارادہ، بری باتوں سے یکسر پرہیز۔“

میں نے کہا:

”خلیل بھائی جو آدمی اپنی بیوی کی تعریف میں گنگا بہا دے اسے کیا کہتے ہیں معلوم ہے۔ جورو کا غلام۔“ ماں چلا کر کہہ اٹھی۔

”اٹھو خلیل اٹھو، ہمیشہ ایسی ہی باتیں، یہ میرا کام ہے، مجھے کرنے دو، تم دکان میں جاؤ۔“

سنتے ہی خلیل بھائی نے سر جھکا لیا اور کوٹنے میں بہت تیزی آ گئی۔ بہت دیر تک نہیں، ماں ذرا یہاں سے وہاں ہوئی کہ نہیں خلیل بھائی پھر شروع اور میں بھی شروع:

”خلیل بھائی ایک بات کہوں؟“

”کہو......“

”بس یہ سمجھ لو جورو کا غلام۔“

”اماں جی!“

وہ مانو ماں کو بلاتا، لیکن جھوٹ موٹ۔

”اماں جی چاندنی یہاں نہیں ہے نا اسی لئے۔ رہتی نا تو وہی ہوتا، نند کے بال بھابی نوچتی اور بھابی کے بال نند۔“

”اچھا جانے دو خلیل بھائی۔ تم تو کہتے ہو گاؤں کی گوری شہر نہیں آتی پھر تم ہی بتاؤ چاندنی بھابی دیکھنے میں کیسی ہے۔“ پرانی پڑھائی پھر سے شروع:

”اگر کہا جائے چاند ہے تو کہتے ہی بات ختم۔ ارے وہ تو چاندنی ہے، مکھن جیسا رنگ، کمر تک اترتے ہوئے سیاہ بال، تکتی ہے تو آنکھ گویا کنول کی پتی، بند ہونے پہ گلاب کی کلی۔ ہم دیکھتے جاتے ہیں اور جیسے ایک حور گھومتی جاتی ہے گاؤں کے کچے راستے پہ کہی۔“

”میں کہوں خلیل بھائی، ایک سچائی۔“

”کہو تو سہی......“

”جورو کا......“

”چپ سے رہو...... بات کوئی اچھی ہوئی نہیں کہ بیکار کی بات شروع......“

کبھی کبھی برے دن اگر ٹوٹ پڑیں تو ایک ایک آدمی اس کا شکار ہو جاتا ہے، وہ دن ایمرجنسی کے تھے۔ گھر سے بلا ضرورت باہر نکلنا مشکل تھا، آفس جانے کے لئے وقت پہ گھر سے نکلتے اور وقت پورا ہوتے ہی لوٹ آتے۔ بے انتہا پابندیوں کا شکار ہو کر لوگ سانس بھی آسانی سے نہیں لے پا رہے تھے۔

”خلیل کو تو گاؤں گئے کافی دن ہو گئے ہیں، وہ اب واپس نہیں آئے گا۔“ ماں اسی طرح خلیل بھائی کو یاد کئے جاتی۔

”اب بازار کون جائے؟ دوا کون لائے؟ راشن کون اٹھائے......“ پھر کہتی:

”وہ بھی کیا کرے شادی ایک ایسی پابندی ہے، کبھی کبھی بیوی کو چھوڑ کر آدمی کہیں نہیں جا پاتا اور یہ ایمرجنسی......“

مصیبتوں میں گھرے دنوں میں ایک دن ایسا نمودار ہوا کہ

PDF Compressor Free Version

خلیل بھائی آپہونچا۔ چہرے پہ کمزوری دکھائی دے رہی تھی۔

''کیوں خلیل کیا بیمار پڑ گئے تھے۔''

''کیا کہیں ایک بڑی مصیبت کا شکار ہو گیا تھا۔''

ماں کو حیرت ہوئی، خلیل بھائی جواب دینے بیٹھ گیا۔

''ہم لوگ تو ٹکٹ کاٹ کر کبھی نہیں جاتے، چنتا تو کی نہیں ٹی۔ٹی آیا پکڑ کر لے گیا اور پولس کو تھما دیا۔''

ماں نے کہا:

''خبردار! اب جب بھی جانا ٹکٹ لے کر جانا۔''

''جی اماں..... جی ہاں اماں جی۔''

''بات ختم ہوئی، کھانا کھایا آرام کیا پھر کام سے لگ گیا۔ یہی تو رواج ہے، ورنہ ہم نے تو کبھی کسی کو ایسا نہیں دیکھا جو بنا کام کے کسی کے گھر میں اپنا ہو کر رہ جاتا ہے، وہ اپنا گھر ہو جب بھی، یہ کہنا بھول نہیں، جس نے کیا سب سے زیادہ کام اس کا ہوا سب سے بڑا نام۔ خلیل بھائی کے ساتھ بھی ہمارا ایسا ہی معاملہ تھا۔ ہم بار بار یہی کہتے تھے۔ خلیل بھائی کو اللہ نے ہمارے پاس بھیجا ہے، پھر اس کے رہتے ہوئے ہمارے دن یوں گزر رہے تھے کہ سناٹا خوشیوں سے بھرا، زیادہ دیر تک نہیں پاتا۔ بہت جلد آواز ہنسی کے ساتھ خود کو جوڑتی اور سر بلند کیے جاتی۔ ہماری باتوں کے درمیاں فکر کے دائرے دکھتے ہی نہ تھے۔ بس ایک بے چینی تھی جو پوچھ بیٹھی:

''خلیل بھائی، اتنے سال گزر گئے شادی کو اب بتاؤ، تمہارے کتنے بچے ہیں؟''

''تم لوگ اگر دعا مانگتے تو سمجھ لو آٹھ دس تو ہوتے ہی۔''

''خلیل بھائی تمہاری شادی کو جو عرصہ بیتا اس حساب سے بات اگر دو چار سے بڑھ کر آٹھ دس کی کی جائے تو پھر لوگ ہمیں پاگل کہیں گے۔'' خلیل بھائی سنجیدہ ہو کر کہنے لگا:

''کہوں تو کیا کہوں اور کہے بنا کیسے رہوں۔ ٹکٹ نہ ملا تو ٹی۔ٹی پکڑ کر پولس کے پاس لے گیا، پولس کے یہاں سے اسپتال، آپریشن کیا ایسا کہ بچوں کی خواہش سے چھٹی ہو گئی۔ پیسے بھی دیے اس نے۔''

''مجھے غصہ آیا میں نے کہنا چاہا۔''

''خلیل بھائی.....''

خلیل بھائی نے آگے بڑھ کر میرا غصہ دبا دیا، وہاں جہاں لے کر گئے تھے نا، کسی بات پہ پولس جو ایک آدمی کو مار رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی:

''مسلمان ہے نا بے! مسلمان ہے نا؟''

''تم کو تو اٹھ کر پولس کو مارنا تھا۔''

''میں کیسے مارتا وہ تو پولس تھا اور میں مجبور حال مجھے آفتاب بھائی یاد آئے۔ گاڑی بناتے ہیں، رہ رہ کر کہتے جاتے ہیں تم مسلمان سہی پہلے تو انسان بنو، گیرج مستری ہے نا ہری بابو وہ کہتا رہتا ہے، پہلے تو سمان جٹانا، ہری دوار پھر بعد میں جانا۔''

''خلیل بھائی جہاں تک میں سمجھتی ہوں ہری بابو ہری دوار کی بات کرے یا آفتاب مسلمان کی، لیکن بات تو دونوں نے ایک دم سیدھی کہی ہے۔ تم سناؤ ہمیں چاندنی بیگم کی بات۔''

''بس شروع نا۔ ارے ہم سے زیادہ تو تم لیتی ہو یہ نام۔ چاندنی، چاندنی، چاندنی بیگم۔'' کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔

دل شکن لمحات کم آتے ہیں، ٹھہر ٹھہر کر آتے ہیں، لیکن آتے ضرور ہیں۔ ماں کو لگاؤ تھا تو صرف چلتے رہنے سے، گھر کے اندر سہی، اب لیٹ گئی تو بستر سے اٹھ نہیں پاتی تھی۔ خلیل بھائی جو گئے تو آئے نہیں۔ دمے کی شکایت نے انہیں ہر کام سے بے بس کر رکھا تھا۔ ان کے نہ آنے میں دیر تو اتنی ہو گئی کہ یادداشت کی سرحد سے کافی دور چلے گئے۔ اتنی دور کہ چہرہ تک یاد کی گرفت میں نہ رہا، ماں کا حال یہ کہ، آنکھیں رہ رہ کر کھلتی تھیں، لیکن انہوں نے دور ہو جانے والے کو پہچان رکھا تھا۔ سچ یہ بھی تھا کہ ماں ہمارا ہاتھ نہ چھوڑتی، تھامے رہتی۔ ان کی ہتھیلی کی ٹھنڈک میرے ہاتھ سے چل کر میرے دل میں داخل ہو جاتی اور میں اپنا سر پھیرے کھڑکی کے باہر آسمان کو تکتی رہتی۔ تارے گم، چاند گم، روشنی بہت کم، آکاش کی آبادی کو کوئی ڈھونڈے بھی تو کہاں۔

''ماں کچھ دیر سہی ٹھہر تو جاؤ.....''

ایسی امید رکھنا ایک رواج ہے صدیوں پرانا کہ میں نے دیکھا خلیل بھائی بیٹھا تھا دروازے کے باہر سیڑھی پہ، سر کو گھٹنوں پہ اوندھا کیے، میری ماں جس کی اماں جی تھیں، چاہتوں بھری پیالی یکدشت

PDF Compressor Free Version

ٹوٹ گئی اور چاہتیں پھیل گئیں یہاں سے وہاں تک۔

''خلیل بھائی ایسی ناساز طبیعت لئے تم چلے آئے، اندر آؤ نا!''

''نہیں'' اگرچہ وہ بول نہیں پا رہا تھا، پھر بھی کہنے لگا:

''اماں جی کے بارے میں..... سنا ہے..... تو دیکھنے چلا آیا .....اماں جی..... جائیں گی نا..... اس کے بعد تو مجھے بھی جانا ہے۔''

''ٹھہرو خلیل بھائی میں ان ہیلر لے آتی ہوں، لیتے ہی طبیعت سدھرے گی تو ماں کے پاس آ کر بیٹھنا۔ میں اِن ہیلر لے کر آئی تو دیکھا، خلیل بھائی جا چکا تھا۔

خلیل بھائی کے جانے کے بعد دکھ بھرا سناٹا بہت دور تک پھیل چکا تھا۔ ماں ہم سے ہاتھ چھڑا کر جا چکی تھی۔ اپنے ساتھ ہماری رغبت لے گئی اور چھوڑ گئی تو چاہتوں کے سنجید لمحے۔ سکوت اندر باہر پھیلا ہوا تھا اب سمٹنے لگا اور بات چیت آہستہ آہستہ اپنے پرانے راستہ پہ آنے لگی۔ کام کاج، روز و شب وہ بھی پرانا راستہ اختیار کرنے لگے۔ حالات کے ایسے ہی دنوں میں بینک کے بینچ پہ بیٹھی اکاؤنٹ نمبر کے انتظار میں تھی، ایک بھلی سی عورت میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''آپ مسلم بھائی کی بہن ہیں نا!''

''جی ہاں!''

''میں خلیل کی بھابی ہوں۔'' میں نے تو کبھی اسے دیکھا ہی نہ تھا، لیکن خلیل کہتے ہی وہ میری آشنا نکل آئی۔

''بھابی، خلیل بھائی کیسا ہے؟''

''وہ تو رہا نہیں، کلکتہ سے گیا گاؤں میں اور پھر اس کے دو دن بعد ہی موت ہو گئی۔''

سن کر مانو شیشے کا بڑا فانوس گر کر زمین پر، چور چور ہو گیا۔

میں نے پوچھا:

''چاندنی کہاں ہے، ماں کے گھر میں ہے؟''

''چاندنی کون؟''

''خلیل بھائی کی بیوی۔''

''شادی ہی نہیں کی پھر بیوی کیسی۔''

اسے جیسے لقوہ مار گیا۔ ❁❁

سانپ سیڑھی (ص ۳۸ سے آگے)

اس وقت عمران بٹ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔

آخر کار اُڑان بھرنے سے پہلے محبوب رہنما کو اس کی یتیمی پر رحم آ گیا۔ وہ پاس آئے۔ والد کے مردہ جسم پر شال ڈالی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ افسوس کا اظہار کیا..... اور پھر ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھتے ہوئے عمران بٹ سے بڑی اپنائیت سے بولے:

''سوری! تم تو اپنی پارٹی کے ہو۔ دوسری پارٹی کا ایک بڑا نیتا پہاڑ کے اس طرف پھنسا ہوا ہے۔ سیٹ صرف ایک خالی ہے۔ اُسے بچا لیتا ہوں تو چیف منسٹر کا مسئلہ حل ہو جائے گا، پھر پارٹی کی جیت.....''

ہیلی کاپٹر اُڑتے ہی اُس کی آنکھوں کے سامنے سانپ سیڑھی کا کھیل گھوم گیا۔ ❁❁

اقوال دانش

☆ حقیقی خوبصورتی کا سرچشمہ دل ہے اگر دل سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں کچھ کام نہیں دیتیں

☆ زندگی کی سب سے بڑی فتح نفس پر قابو پانا ہے اگر نفس دل پر فاتح ہو گیا تو سمجھو، دل مردہ ہے

☆ دشمنوں کے سامنے ایسی گفتگو کرو کہ اگر وہ دوست بن جائیں تو پھر تمہیں شرمسار نہ ہونا پڑے

☆ بہت سی چیزیں وہ ہیں جو انسان خود سیکھتا ہے اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اسے وقت سکھا دیتا ہے

☆ دنیا میں درس عبرت تو بہت سارے ہیں، مگر عبرت حاصل کرنے والے بہت کم ہیں

☆ پست حوصلہ کفر کی علامت ہے

☆ وقت انصاف پسند ہوتا ہے، ہمیشہ ہمت اور حوصلہ سے کام لو اور زمانے کا رخ موڑ دو

☆ خاموشی علم و حکمت کے دروازوں میں سے ایک ہے

PDF Compressor Free Version

منظومات

ڈاکٹر علی عباس امید

01, Star Residency, Idgah Hills, Bhopal 462001 (M.P.) (Mob. 09200846045)

لمحوں کا حاصل

وہ ایک ساعت
وہ ایک ساعت عزیز تر ہے
وہ ایک ساعت عظیم تر ہے
وہ ایک ساعت
جو وقت کے لازوال صحرا میں
ایک ذرہ سے کم بہت کم
وہ ایک ساعت
جو وقت کے بیکراں سمندر میں
ایک قطرہ سے کم بہت کم

وہ ایک ساعت، جو کچھ نہیں ہے
وہ ایک ساعت، بہت گراں ہے
وہ بیکراں ہے
تمام لمحے
کہ جن میں گرمی ہے، رنگ و بو ہے
وہ ان کا حاصل ہے، جستجو ہے

اس ایک ساعت کے بدلے دے دوں
اک ایک پل میں شگفتگی کا
اک ایک پل اپنی زندگی کا
سنہری یادیں، روپہلے سپنے
تمام لمحے کہ جو ہیں اپنے
اس ایک ساعت کی نذر کر دوں
کہ جس میں تم چونکتی، جھجھکتی
خود اپنی سوچوں پہ مسکراتی،
بدن چراتی
حیا کے دامن میں منھ چھپائے
نظر جھکائے
مرے قریب آئی ہو
اور تمہاری خوشبو نے یہ کہا ہے
یہ دن ہے اپنا یہ رات اپنی
حیات اور کائنات اپنی
طویل ہیں زندگی کی راہیں
طویل راہوں پہ صرف میں ہوں
طویل راہوں پہ صرف تم ہو

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

جمالؔ اُویسی

HOD Urdu, MRM College, Darbhanga 846004 (Mob. 07352284181)

پانچ نظمیں

لامتناہی رات

دھواں تھا
مگر آگ ظاہر نہ تھی
چشم بینا
مگر کتنی مجبور تھی
گھپ اندھیرے میں
ماچس جلا کر
نہ جانے کسے ڈھونڈتی رہ گئی
آسماں پر ستارے ہنسے
پھر دھواں آدمی سے لپٹتا رہا
اُس کو آغوش میں لے کے بہتا ہوا
اک طرف چل پڑا
جس کے آگے بہت شور تھا
رات کا قافلہ
آدمی کو جکڑتا ہوا
اس کے اظہار کو
مسخ کرتا ہوا
یوں امر ہو گیا
جس کے انجام میں
آج بھی رات ہے
رات ہی رات ہے
تیرگی اور دھواں
دونوں اک شغل میں
جاوداں ہو گئے

کہاں ہوں میں؟

ستارۂ شب کے قلب میں ہوں
کہ گرد ہوتے ہوئے اجالوں کے ڈھیر میں ہوں
شہاب ثاقب کی تیز رفتار موج میں ہوں
کہ سرد ہوتے ہوئے بگولوں کی اوٹ میں ہوں
کوئی تو بتلائے ارض میں ہوں
کہ عرش پر ہوں
کہیں تو میں ہوں
کہ ایک رفتار میرے دل کے سراب خانے میں گونجتی ہے
کہ ایک آواز میرے لب تک پہنچ کے خاموش ہو گئی ہے
کہ ایک گردابہ محو حیرت ہے
جم کے تصویر بن گیا ہے

PDF Compressor Free Version

مرا یہ بکھرا ہوا تعارف ہے
میں کہاں ہوں؟

بے شناخت ہونے کے لئے

شعور آمادۂ جنوں ہے
یہ تانپورا
بجاؤ اتنا کہ شور برپا ہو میرے اندر
میں کانچ کے برتنوں کی مانند ٹوٹ جاؤں
سمیٹنے کے لئے کوئی ہاتھ بڑھ نہ پائے
جو فکر مجھ کو جلائے اس فکر سے پرے تم
بجاؤ اتنا کہ بھول جاؤں
یہ نام و منصب، یہ مرتبہ اور آدمیت
میں ہو تو لوں بے شناخت پھر سے

عالم رتق کی طرف

جاوداں ہونے لگا پھر سے دھواں
اور جمنے لگ گئی ہے تیرگی
پھر سے اک محراب سی بننے لگی افلاک میں
ساری ارواحِ قدیم
سو چکی ہیں گہری نیند
دور اربوں نوری سال
جھلملاتے رہ گئے
اور اک آواز جو رہتی تھی ہر لمحہ بلند
چپ اچانک ہو گئی
بند پھر سے ہو گیا ہے
روشنی کا کارواں
جاگ اٹھے سب دیو قامت اور نہاں!

بلاوجہ

تیرے ملنے سے کوئی بات بھی پیدا نہ ہوئی
منتظر تھا میں ازل سے کہ ملاقات کروں
اور پوچھوں کہ تجھے دیکھنے سے سارے سوال
خود بہ خود حل ہوئے تو میری ضرورت کیا تھی
میری ہی کیا، میرے حوالوں کی ضرورت کیا تھی
آج میں چپ ہوں کہ تو بھی نہیں حیران ذرا
وقت ہے فلسفہ ہے آدمی ہے اور تو ہے
ہولناکی سی بناتی ہوئی یہ خاموشی
اک زبردست طمانچہ ہے مرے چہرے پر
جو بھی ہونا تھا ہوا، جو نہیں ہونا ہے وہ ہو
فرق کیا پڑنے کو ہے شام و سحر کے رم میں
اک بلاوجہ کی تشکیل عناصر کو ثبات
چھوڑ دینا انہیں پھر یوں ہی تڑخنے کے لئے
اپنا سا منھ لئے بازارِ تناسب میں کھڑا
مجھ کو جینے کی کوئی وجہ نظر آتی نہیں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

علیم صبا نویدی

No. 192/266, Triplicane High Road, Flat No. 16, Second Floor
Rice Mandi Street, Chennai 600005 (Mob. 9840361399)

غزلیں

دل بھی محصورۂ امید میں فانی نکلا
نقش ، احساس کا توضیح جوانی نکلا

لفظ و معنی بھی رہائی کے لئے کوشاں تھے
جذبہ فکر گرفتارِ زمانی نکلا

آنچ دیتی رہیں چند ایک حقائق کی لویں
واقعہ مرا حقیقت تھا ، کہانی نکلا

وقت نے رُک کے بچھا دیں وہیں اپنی باہیں
مرا اظہار جہاں عطر فشانی نکلا

داغ سرمایۂ سیال تھا ، پہناں ہی رہا
لاوا اک درد کا پلکوں کی زبانی نکلا

فاصلے ، دھوپ کو کلغی پہ اٹھائے رکھے
وقت باہوں میں لئے شام سہانی نکلا

کاغذی عمر نویدی کی معطر کرنے
جوہر نقش قلم ، فکر رسانی نکلا

❁❁❁

اپنے اندر جو سمٹ کر ایک قطرا ہوگیا
تھاہ میں اپنی اتر کر اور اونچا ہوگیا

جلوتوں کی مانگ بھرنے کا نہ تھا جس میں شعور
خلوتوں کی تیرگی میں وہ اُجالا ہوگیا

پیراہن سے پھوٹتی لوبانی خوشبو کی برات
پاؤں شب کے بھی نہ چھو پائی سویرا ہوگیا

اب کے آئے یا نہ آئے پھول والوں کا جلوس
چاہتوں کی سیج پہ سپنا سلونا ہوگیا

دھوپ کے ماتھے پہ بندھیا کی چمک باسی ہوئی
شب کے دامن سے لپٹ کر دن بھی میلا ہوگیا

ہم کہاں لے جائیں سانسوں میں چھپی زخمی امنگ
ہوگئی وحشت فزوں ، ہر سو اندھیرا ہوگیا

رنگ لائیں قربتیں تو سب نے دیکھا ایک صبح
اس کا چہرہ ، میرا چہرہ ، اپنا چہرا ہوگیا

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

شمس فریدی

غزلیں

اسے سہنا بھی مجھ کو پڑ رہا ہے
سلوک اس کا اگرچہ نا روا ہے

قریب جاں ہے اور نا آشنا ہے
محبت میں یہ کیسا فاصلہ ہے

اسے پانے کی حسرت تو بہت تھی
اسے پا کر بھی دل ڈوبا ہوا ہے

اجالا بانٹنے والوں کے گھر میں
اندھیرا آج کچھ حد سے ہوا ہے

بچائیں کس طرح کشتی کو اب ہم
ہوا کا رخ بدلتا جا رہا ہے

سنبھل جاؤ زمیں والو کہ ورنہ
سوا نیزے پہ سورج آ رہا ہے

خموشی بولتی پھرتی ہے ہر سو
زبانِ خلق کو کیا ہوگیا ہے

❁❁❁

کیا گل کھلا رہی ہے ہوا دیکھئے ذرا
موسم نے کیا کمال کیا دیکھئے ذرا

تاریک ہوگئی ہے فضا دیکھئے ذرا
چھائی ہوئی ہے کیسی گھٹا دیکھئے ذرا

برہم نہ ہوگا مجھ سے خدا دیکھئے ذرا
وہ یاد آئے وقت دعا دیکھئے ذرا

صدیوں کی یادگار مٹا دی گئی مگر
کیا اس میں کچھ کسی کو ملا دیکھئے ذرا

طوفاں کا زور زور قیامت سے کم نہ تھا
محلوں میں جھاڑو پھیر گیا دیکھئے ذرا

ملنا محال ہوگیا اب اپنے آپ سے
کیا حال اس نے میرا کیا دیکھئے ذرا

اک پل میں سر بلند زمیں بوس ہوگیا
کیا حشر اس کا آج ہوا دیکھئے ذرا

ہر شام آبدیدہ ہے، ہر پھول ہے اداس
کیسی چلی ہے بادِ صبا دیکھئے ذرا

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر رونق شہری

At & P.o. Panchanpur, Dist Gaya (Mob. 9905185658)

غزلیں

بہ چشمِ وقت ، تو دیکھ اب فسانہ ہوتے ہوئے
تمہارے پاس میں پہنچا زمانہ ہوتے ہوئے

خیال اپنا ہے پہنا ہوا لباس نہیں
بہت عزیز ہے کپڑا پرانا ہوتے ہوئے

مقامِ حرص و ہوس ہی دکھائی دے گا اسے
کہ سانپ آیا ہے گھر تک خزانہ ہوتے ہوئے

ملال مجھ کو ہی تھا اپنی بے نیازی پر
وہ مڑ کے دیکھ رہا تھا روانہ ہوتے ہوئے

نہیں کھلیں گے یہاں پھول جیسے چہرے اب
اڑے گی خاک سی موسم سہانا ہوتے ہوئے

سراغ موسمِ باراں اگر انہیں ملتا
نہیں بھٹکتے پرند آشیانہ ہوتے ہوئے

❁❁❁

کئی چہرے جو درپن میں پڑے ہیں
نکالیں کیسے الجھن میں پڑے ہیں

نہ سوئے ہیں نہ جاگے جانے کب سے
بچھا کر کھاٹ آنگن میں پڑے ہیں

بخارِ جسم سے اٹھتا دھواں ہے
نہ جانے کب سے ایندھن میں پڑے ہیں

ہمارے ہی تدبر سے کھلیں گے
جو ٹانکے زخم دشمن میں پڑے ہیں

اٹھالے قاعدے سے کوئی ان کو
حسیں کانٹے جو گلشن میں پڑے ہیں

سنانے کیوں لگے رودادِ صحرا
یہاں جھولے بھی ساون میں پڑے ہیں

گئے تھے ڈھونڈنے لاشیں عدو کی
انہیں کے ساتھ اب رَن میں پڑے ہیں

بریدہ سر کی بھی ہوتی ہے قیمت
کئی سونے کے برتن میں پڑے ہیں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

خورشید طلبؔ

G.M. Office, Kargali, P.o. Bermo, Dist. Bokaro 829104 (Mob. 8986613942)

غزلیں

سر نیند کی چادر سے ، قدم گھر سے نکالیں
ڈوبے ہوئے سورج کو سمندر سے نکالیں

جیسے بھی ہو اس حبس کی دیوار کو توڑیں
دروازہ کوئی گنبد بے در سے نکالیں

کچھ اوس کی بوندیں کسی سبزے سے نچوڑیں
کچھ آگ بدن چیر کے پتھر سے نکالیں

خشکی بھی رہے آنکھ میں یک گونہ نمی بھی
دریا کوئی صحرا کے برابر سے نکالیں

پرواز کی حسرت میں خجل ہوتے پرندے
حسرت اسی ٹوٹے ہوئے شہپر سے نکالیں

روشن بھی نہ ہو شام غریباں کبھی گھر میں
رشتہ بھی مگر اپنا ''بہتر'' سے نکالیں

جو لمحۂ خالی سے نکالے ہمیں باہر
تاریخ کوئی ایسی کیلنڈر سے نکالیں

ہر اگلا قدم ایک نئے پانی میں رکھیں
ہر روز نیا سودا طلبؔ سر سے نکالیں

❁❁❁

فلک کے قہر ، زمیں کے فشار سے نکلے
چلو زبان و مکاں کے حصار سے نکلے

جمی ہوئی ہے جو سینے میں ٹھیک دل کی جگہ
وہ موج خوں بھی کبھی آر پار سے نکلے

میں چل پڑا ہوں کسی اور ہی جہاں کی طرف
اسے کہو وہ مرے انتظار سے نکلے

جب آسمان سے آنکھیں اتار کر دیکھا
نہ جانے کتنے ستارے غبار سے نکلے

تمہارے شہر میں آکر یقیں نہیں آتا
ہمیں زمانے ہوئے اندھے غار سے نکلے

عجب نہیں جو سمندر میں خاک اڑنے لگے
ندی مچلتی ہوئی ریگزار سے نکلے

بدل کے رہ گئی ہر چیز ہی درون و بروں
کچھ اور ہو کے طلبؔ کوئے یار سے نکلے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

راشد جمال فاروقی

C-1452, I.D.P.L. Township Virbhadra (Rishikesh)
Dehradun, U.K. 249202

غزلیں

اک ذرا ٹھیس لگے دل پہ تو دریا ہو جاؤں
بے حسی ذہن پہ طاری ہو تو صحرا ہو جاؤں

میرے چہرے کی عبارت سبھی پڑھ لیتے ہیں
جو ذرا دیر میں حل ہو وہ معمہ ہو جاؤں

بے بسی ، یاس و الم حد سے گزر جائیں اگر
جس سے مرتا ہوں اسی زہر سے اچھا ہو جاؤں

کبھی اپنی تو کہے وہ ، کبھی میری تو سنے
وہ مجھے یہ تو بتائے کہ میں کیسا ہو جاؤں

تو مجھے ایسے پڑھے مرے سوا کچھ نہ پڑھے
میں ترے ہاتھ میں اچھا سا رسالہ ہو جاؤں

حبس میں کب سے پڑا ہوں کسی پتھر کی طرح
ایک طوفان اٹھے اور میں تنکا ہو جاؤں

باپ کے کانپتے شانوں کو سنبھالوں راشد
ماں کی بجھتی ہوئی آنکھوں کا اجالا ہو جاؤں

❁❁❁

اس آسمانِ ستم پر سحاب تھا ہی کہاں
زمیں کہ وحشت الم تھی سراب تھا ہی کہاں

یہ سب علوم تعقل کی بات کرتے تھے
دلوں کے واسطے کوئی نصاب تھا ہی کہاں

مری دریدہ لباسی پہ ہنس رہے تھے سبھی
مرے سوا کوئی خانہ خراب تھا ہی کہاں

میں اس ذلیل سی بے مائیگی پہ نادم ہوں
مگر تمہارے کرم کا حساب تھا ہی کہاں

بس اک تلاشِ عبث تھی کہ آج ختم ہوئی
کسی کتاب میں فرصت کا باب تھا ہی کہاں

سبھی مظاہر فطرت پکارتے تھے مجھے
کسی بھی چہرے پہ کوئی نقاب تھا ہی کہاں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

سہیل اختر

D.G.M. (C), IDCO, IDCO Towers, Janpath
Bhubaneswar 751022 (Mob. 9437044651)

غزلیں

بزم تنہائیوں کے ڈر سے ہے
شور خاموشیوں کے ڈر سے ہے
دشت میں اک ذرا سکون تو ہے
وہ بھی آبادیوں کے ڈر سے ہے
کب تھی جدت کوئی تماشے میں
سب تماشائیوں کے ڈر سے ہے
سچ تو یہ ہے کہ روشنی کا چلن
صرف تاریکیوں کے ڈر سے ہے
ہارنے کا ہے حوصلہ کس میں
جیت ناکامیوں کے ڈر سے ہے
یہ تخیل کی بے تکان اُڑان
فکر کی کھائیوں کے ڈر سے ہے
جھوٹ کے کاروبار کی رونق
ساری سچائیوں کے ڈر سے ہے
یہ جو سنجیدگی ہے محفل میں
میری نادانیوں کے ڈر سے ہے
ان دنوں فن سہیل گوشہ نشین
بس پذیرائیوں کے ڈر سے ہے

❁❁❁

ہم بھی پیدا ہوئے ضرورت سے
ختم ہوجائیں گے سہولت سے
آج کل ہم ہیں کس قدر مصروف
وقت کٹتا ہے کیا فراغت سے
کب سے شہر عجائبات میں ہوں
کب ملاقات ہوگی حیرت سے
سچ مجھے بولنا ہے بستی میں
اور نوازا گیا ہوں لکنت سے
دشت نادان ٹوکتا ہے مجھے
ڈر تو لگتا نہیں ہے وحشت سے
سب پہ روشن ہے میرا حال مگر
کوئی واقف نہیں ہے حالت سے
ہوں کھلونا ، سو ٹوٹ کر خوش ہوں
ہے الرجی مجھے حفاظت سے
دیکھو کیسے بدل رہا ہوں میں
ایک عادت کو ایک عادت سے
عالموں پر پڑا وہ وقت سہیل
کام نکلا مرا جہالت سے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

فراغ روہوی

67, Maulana Shaukat Ali Street, Kolkata 700073 (Mob. 9830616464)

غزلیں

جو آزماؤ گے ، اپنا ہنر دکھا دوں گا
غزل کے نور سے محفل کو جگمگا دوں گا
بغاوتوں کے شراروں کو میں ہوا دوں گا
اساسِ قصرِ ستم خاک میں ملا دوں گا
سفر حیات کا آسان تر بنا دوں گا
تمہاری راہ کے پتھر کو میں ہٹا دوں گا
مجھے جھکا نہ سکے گی ادائے سلطانی
درِ خلوص ملے گا تو سر جھکا دوں گا
میں اپنی ذات سے دریا نہیں سہی پھر بھی
سحاب ہوں تو تری تشنگی مٹا دوں گا
مرا جنون سلامت رہا تو سب کے لئے
نئی زمین ، نیا آسماں بنا دوں گا
غم فراق کی باتیں نہ ہوں گی ہونٹوں پر
جو حال پوچھو گے میرا تو مسکرا دوں گا
کسی نے دیکھا نہیں حوصلہ مرا اب تک
''شکستہ پا ہوں مگر تم کو آسرا دوں گا''
کب اختیار میں اپنے ہے ماسوا اس کے
فقیر شہر ہوں ، دشمن کو بھی دعا دوں گا
اسی کے دم سے منور ہے شاعری اپنی
چراغِ درد کو کس طرح میں بجھا دوں گا
نہ اوڑھ اتنی شرافت کہ تو مذاق بنے
فراغ آ تجھے جینے کے ڈھب سکھا دوں گا

❁❁❁

جواب دینا کوئی ہوگیا محال بہت
کہ دل بھی بچوں سا کرنے لگا سوال بہت
ستانے جب سے لگا ہے ترا خیال مجھے
بدن کے دریا میں اٹھنے لگا اچھال بہت
انہیں ملا دو ، وہ غرقاب ہو بھی سکتے ہیں
جوان جسموں کو ہے شوقِ اتصال بہت
اُڑے نہ خود کبھی ، لیکن اُڑائے طیارے
اسی کو لوگ سمجھتے رہے کمال بہت
اُڑان بھرنے کا جن کو جنون ہوتا ہے
بچھائے جاتے ہیں ان کے لئے ہی جال بہت
عروج کب تھا ہمارے نصیب میں کہ ہمیں
ستاتا شام و سحر ، خدشہ زوال بہت
ہماری فکر کہاں تھی ہمارے یاروں کو
عدو نے رکھا ہمارا مگر خیال بہت
سنبھل سنبھل کے اٹھانا ہے ہر قدم مجھ کو
مرے خلاف ستاروں کی اب ہے چال بہت
فراغ مجھ پہ ہے صدقہ اتارنا واجب
خیال دریا میں ہے روز و شب ابال بہت

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

مشتاق جاوید

P-121, Khansama Para, Mitia Bridge, Kokata 700024 (Mob.08100018425)

غزلیں

مری نگاہ کو منظر عجب دکھاتے ہیں
کنارِ آب جو بستی نئی بساتے ہیں
اُنہیں پتہ ہے کہ منزل ہے اُن کی دار و رسن
مگر وہ پرچم حق اب کہاں اُٹھاتے ہیں
تمہارے ہاتھ میں پتھر ہیں ، مت چلاؤ انھیں
کہ دل تو باتوں ہی باتوں میں ٹوٹ جاتے ہیں
اِسی سبب سے کہ بچوں کے دل بہل جائیں
ہم آج شہر میں کرتب نیا دکھاتے ہیں
امیر زادے بنے ہیں جو اُن کی محنت سے
غریب لوگوں کو اِک پل میں بھول جاتے ہیں
وہ خواب جس کی بدولت ہوئے تھے ہم رسوا
وہ خواب آپ ہمیں کس لیے دکھاتے ہیں
ہزار شک کی نگاہوں سے تم ہمیں دیکھو
مگر وطن کے لیے ہم ہی سر کٹاتے ہیں
ہمارے شہر کے اہل جنوں ہیں کیا یا رب
صلیب و دار کے قصے فقط سناتے ہیں
یزید پائے گا جنت کہ وہ مجاہد تھا
''فقیہ وقت شگوفے نئے کھلاتے ہیں''
دغا و مکر کی دنیا میں آج بھی جاوید
ہم اہل دل تو وفاؤں کے گیت گاتے ہیں

❁❁❁

زلفیں خوشبودار ، ادا بھی پیاری ہے
اس کا پیکر ایک حسیں پھلواری ہے
تم نے آنکھیں پھیر لیں مجھ سے کیوں جاناں؟
آج کی شب ہر لمحہ مجھ پر بھاری ہے
کون خریدے اِس کو اُونچی قیمت میں
میرے گھر میں بوسیدہ الماری ہے
رخت سفر باندھا ہے اُس نے کیوں آخر
یوں لگتا ہے ہجرت کی تیاری ہے
بوڑھے باپ کا قتل کیا کل بیٹے نے
زر کی خاطر یہ کیسی مکاری ہے
کیسے بھلا دوں میں ماضی کی یادوں کو
تیری ذات سے آج بھی مجھ کو یاری ہے
جب ملتا ہے زخم ہی دیتا ہے مجھ کو
شہر وفا میں یہ کیسی دلداری ہے
آئینوں سے اُس کو ملے گا کیا آخر
وہ انساں تو پتھر کا بیوپاری ہے
قاتل کی بستی میں یہ معلوم ہوا
اب کی بار تو میرے سر کی باری ہے
گھات نہ کر اپنے بھائی سے تو جاوید
یہ انسانی رشتوں سے غداری ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

شمس قریشی

Moh. Usmanpur, Post Jalalpur,
Dist. Ambedkar Nagar 224149 (Mob. 09565059506)

وہ شرق و غرب ، جنوب و شمال چاروں طرف
بہ تحت و فوق اسی کا جمال چاروں طرف

سفر کدھر کا کریں ، کس جگہ قیام کریں
یہاں سے اور بھی بدتر ہے حال چاروں طرف

کھلی جو آنکھ تو یہ راز بھی کھلا مجھ پر
میں اک مقام پہ ، میرا خیال چاروں طرف

مگر یقین نہ آئے تو دیکھ لو پھر کر
کہ اڑتی پھرتی ہے گردِ ملال چاروں طرف

یہ کس مقام پہ لائی ہے زندگی آخر
کہ بس دراز ہیں دست سوال چاروں طرف

یہ چلچلاتی ہوئی دھوپ ، آتشیں موسم
اک آفتاب کا اُف یہ جلال چاروں طرف

ہمارے عہد کمالات کا یہ بد انجام
کہ بے مثال ہے شمسی زوال چاروں طرف

❁❁❁

اشرف مولانگری

Registary Office Pupri, P.o. Janakpur Road
Sitamarhi 843320 (Mob. 09162722233)

خواہش کا زہر پی کے میں اندر سے کٹ گیا
جب رشتہ امید ہی دلبر سے کٹ گیا

تم رشک ماہتابِ شب آرزو سہی
میں بھی تھا اک ستارہ جو محور سے کٹ گیا

احباب رخ بدلنے لگے جب سے راہ میں
تیور بدل کے میں بھی برابر سے کٹ گیا

نکلے تھے گھر کو چھوڑ کے جس کی تلاش میں
وہ خوشنما جزیرہ سمندر سے کٹ گیا

اپنی جگہ پہ آج بھی ہر چیز ہے مگر
اک میں تمہارے گاؤں کے منظر سے کٹ گیا

چاک گریباں اپنا دکھاتے بھی کس کو ہم
جب کارواں ہمارا رفوگر سے کٹ گیا

اک عمر میں نے رکھا تھا جس کو سنبھال کے
وہ ہم سفر بھی آج مقدر سے کٹ گیا

روزی کی جستجو میں ، خوشی کی تلاش میں
وہ شخص بدنصیب ہے جو گھر سے کٹ گیا

کیسے دکھاؤں تجھ کو میں اشرف نشانِ زخم
"اپنا گلا تو پیار کے خنجر سے کٹ گیا"

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

کتابوں کی دنیا

نام مجلّہ	:	سہ ماہی دسترس، دھنباد، نازشؔ سہسرامی نمبر
مدیر	:	ڈاکٹر رونقؔ شہری
اشاعت	:	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء (شمارہ ۵-۶)
صفحات	: ۲۵۰	قیمت : ۱۰۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر نسیم اختر

مولانا انوارالحق شہودی نازشؔ سہسرامی (۱۹۱۵ء-۱۹۸۳ء) کے مورث اعلیٰ حضرت امیر کبیر الدین الحسنی، قطب الدین ایبک کے زمانہ میں ہندوستان تشریف لائے۔ مولانا کے اسلاف مشرقی اتر پردیش سے صوبہ بہار کے سہسرام آئے اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ نازشؔ سہسرامی کے دادا حضرت قاضی وحیدالحق حضرت شاہ قیام اصدق چشتی پیر بیگہ ضلع نالندہ سے شرف بیعت رکھتے تھے، جب کہ ان کے والد، حضرت شاہ قیام اصدق کے فرزند اور جانشیں حضرت شاہ شہود الحق سے مرید تھے۔ مولانا انوارالحق شہودی نازشؔ سہسرامی اپنے والد و مرشد حضرت وصی الحق سے مرید اور بعدہٗ مسند سجادگی پر متمکن ہوئے۔

مولانا کی تعلیم اتر پردیش کے دو تعلیمی مراکز ''مدرسہ سبحانیہ'' الٰہ آباد اور ''جامعہ نعیمیہ'' مرادآباد میں ہوئی، تکمیل تعلیم ''مدرسہ فیض الغربا'' آرہ میں ہوئی۔ جیسا کہ عام طور پر صوفیائے کرام کا شیوہ رہا ہے مولانا نے بھی درس وتدریس کو اپنا مشغلہ حیات اور رشد ہدایت کو وظیفہ زندگی بنایا۔ شاعری وراثت میں ملی جسے ان کی طبع موزوں کے ساتھ جگر کی شاگردی اور اقبالؔ سے ذہنی ہم آہنگی نے دو آتشہ بنادیا۔ ان کے کلام کا چار مجموعہ ''حرف تمنا''، ''حریم شوق''، ''شفق رنگ'' اور ''حضرت نازشؔ سہسرامی کے سو اشعار'' منظر عام پر آچکے ہیں جب کہ نصف درجن نثری کتابوں میں ''وحدت الٰہیہ''، ''شرف آدم کا نقطہ عروج''، ''تصوف و رہبانیت کی حقیقت''، ''اسلام کا روحانی نظام''، ''فوز وفلاح کی گمشدہ کڑی'' اور ''مقالات شہودی'' جیسی گرانقدر تصانیف انہیں ایک منفرد شاعر، ایک جید عالم دین، ممتاز مفکر اسلام اور صاحب طرز نثر نگار کی حیثیت سے متعارف کراتی ہیں۔

سہ ماہی ''دسترس''، دھنباد، شمارہ ۵-۶ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء)

''مولانا انوارالحق شہودی نازشؔ سہسرامی نمبر'' مولانا موصوف کی حیات و خدمات پر مشتمل ایک قیمتی دستاویز ہے جو اپنی ظاہری خوبصورتی کے ساتھ باطنی خوبی سے بھی متصف ہے۔ یعنی یہ جمال وکمال کا ایک ایسا مرقع ہے جو باذوق قارئین کو بیک نظر متوجہ کرنے میں کامیاب معلوم ہوتا ہے۔ مختلف ذیلی عنوانات کے تحت اس کی فہرست کی ترتیب وتنظیم جس حسن سلیقہ سے کی گئی ہے اس سے ''دسترس'' کے مطالعہ کی تحریک وترغیب ملتی ہے جس سے مولانا انوارالحق شہودی نازشؔ سہسرامی کی زندگی کے قابل ذکر گوشے ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

''شاعری'' یہ ''دسترس'' کا سب سے پہلا باب ہے جس میں حضرت نازشؔ سہسرامی کی سخن وری اور ان کے شعری مجموعہ سے متعلق گیارہ دانشوروں کی نگارشات سے استفادہ کا موقع ملتا ہے۔ یہ تحریریں جہاں قلب ونظر کو جلا بخشتی ہیں، وہیں ان کے مطالعہ سے نازشؔ سہسرامی کے شعری امتیازات بھی سامنے آتے ہیں۔ موصوف ایک اعلیٰ پایہ کلاسیکی شاعر تھے جو فنی باریکیوں پر گہری دسترس کے ساتھ ساتھ ماضی وحال پر بھی عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں تصوف، تظلم، تفکر، تدبر اور تغزل کا بہترین توازن اور امتزاج ملتا ہے۔ ان کے یہاں اساتذہ کی

PDF Compressor Free Version

صفات سے بھرپور پختگی کے ساتھ ان کے استاد معنوی علامہ اقبالؔ اور استاد حقیقی جگرؔ مرادآبادی کے رنگ وآہنگ کے علاوہ ان کے منفرد لب و لہجہ کی صدائے بازگشت ان کی نظموں اور غزلوں میں بھی سنائی دیتی ہے جو انہیں اپنے معاصرین ہی میں نہیں بعض قدما میں بھی ممتاز کرتی ہے۔

محبت رفتہ رفتہ کام اپنا کرتی جاتی ہے
طبیعت آشنائے لذت غم ہوتی جاتی ہے

مرے عشق کی حکایت ہے چراغ شام غربت
مرے درس بے خودی کو نہ بھلا سکا زمانہ

اے شوق ناتمام تجھے کیا خبر ابھی
مانگے ہے عشق حوصلہ بال و پر ابھی

۱۹۴۶ء کے فسادات کے پس منظر میں ان کی نظم کے یہ اشعار انتہائی پردرد اور المناک ہونے کے ساتھ سامان عبرت بھی ہیں اور لمحہ فکریہ بھی۔

اللہ رے چھیالیس کے یہ غم ناک نظارے
بیواؤں کی آہوں میں قیامت کے شرارے

بے باپ کے بچوں کا تڑپنا اور سسکنا
بے گور وکفن ان گنت نعشوں کے نظارے

ہر ہندو مسلماں پہ شامت کا چڑھا بھوت
لو پڑ گیا منجدھار میں آزادی کا ناپوت

پیش نظر شمارہ میں نازشؔ سہسرامی کی شاعری کو اولین ترجیح دینے اور جستہ جستہ کلام نازش کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ''دسترس'' کے مدیران نے مولانا کے علمی وادبی کارناموں میں ان کی شاعری کو مقدم رکھا ہے۔ اس شمارہ میں ان کی شاعری کا جو نمونہ کلام اور انتخاب ہے اور ان پر لوگوں کی جو گرانقدر آرا ہیں ان سے بھی یہ حقیقت مترشح ہے کہ نازشؔ سہسرامی کے یہاں تازگی فکر، طرفگی خیال اور فلسفیانہ افکار کے ساتھ متصوفانہ خیالات کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔

یہ فریب لذت بے خودی، یہ غریب شہر کی گم رہی
شب تار کتنی دراز ہے کہیں دور تک بھی دیا نہیں

''نثر'' اس حصہ میں مولانا کی نثری تصانیف سے متعلق آٹھ مضامین ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی مذہبی، روحانی، علمی وادبی خدمات کے ساتھ حیات وکارنامے کے گوناگوں روشن پہلو ہمارے سامنے آتے اور ہمارے علم وآگہی میں اضافہ کا باعث بن جاتے ہیں جب کہ ''شخصیت'' کے تحت پانچ مضامین مولانا کے اسلاف کے ساتھ ان کی ذات وصفات، کمالات اور ان کے تبحر علمی پر انتہائی جامع اور معلومات افزا ہیں۔

''تاثرات'' کے حوالے سے ملک وملت کی سترہ عبقری شخصیتوں کا پرخلوص خراج عقیدت ہے جس سے مولانا انوار الحق شہودی نازشؔ سہسرامی کے کارنامے قاری پر منکشف ہوتے ہیں اور یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ انہوں نے جہاں علم وادب کے بے شمار چراغ روشن کئے، وہیں رشد وہدایت سے بھی بہتوں کو فیض یاب کیا۔ اس طرح ''منظوم تاثرات'' میں گیارہ جید شعرائے کرام کی مولانا کے تئیں گہری عقیدتمندی کے ساتھ ان حضرات کے جذبات واحساسات کا راست اظہار بھی ہے۔ دراصل مولانا کے تعلق سے ''دسترس'' کا مذکورہ دونوں باب ان کے کارہائے نمایاں، ان کے افکار وخیالات اور ان کی بصیرت و بصارت کا اعتراف ہے جو ان کے معاصرین اور بزرگوں نے کیا ہے۔

''دسترس'' کے اس خصوصی شمارہ میں مولانا کی سخن وری کے نمونے ''منتخب غزلیں'' میں دیکھے جاسکتے ہیں جن کی تعداد ۴۳ ہے۔ اسی طرح ''منتخب نثر پارے'' کی تین نگارشات ان کی نثری نمونوں کے ساتھ دعوت غور وفکر بھی دیتی ہیں اور عمل کی حرارت بھی عطا کرتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تحریر شخصیت کا آئینہ ہے۔ منتخب نثر پارے کے تین مشمولات بخط نازشؔ سہسرامی (صفحہ ۵۰-۲۴۸) کے اس امر کی تصدیق ہوجاتی ہے۔

سہ ماہی ''دسترس'' کے اس خصوصی نمبر کا مطالعہ کرتے ہوئے نازشؔ سہسرامی کی کثیر الجہات شخصیت پرت در پرت کھلتی ہے جس میں ان کے کلام کا سوز وگداز بھی ہے۔ رشد وہدایت کی تلقین بھی اور ادب کی لذت وچاشنی کے ساتھ ساتھ توانائی بھی۔ یہ شمارہ موصوف پر ایک قابل قدر سرمایہ بھی ہے اور اضافہ بھی جس سے ان کی عظمت وانفرادیت کے ساتھ ان کے اسلاف واخلاف کے کارنامے کی ایک جھلک سامنے آتی ہے اور اس سے فرحت وانبساط کے ساتھ رشک بھی آتا ہے ع

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

نام کتاب : مسرت کے ترانے
مرتب : ضیاء الرحمٰن غوثیؔ
ناشر : دارالتصنیف وتالیف، سمستی پور، بہار
اشاعت : ۲۰۱۵ء صفحات : ۱۲۰
قیمت : ۱۵۰روپے
مبصر : **محمد شوکت جمال**

علم وادب کی دنیا میں کتابوں کے ساتھ ساتھ رسالوں کی اہمیت بھی مسلم ہے، مگر ان دونوں میں ایک خاص فرق یہ ہے کہ کتابوں کی دستیابی آسان ہوتی ہے اور رسالوں کی دستیابی نسبتاً مشکل کیونکہ ان کے ایڈیشن دوبارہ نہیں چھپتے۔ ایسی صورت میں اگر کسی مجلہ خصوصاً بچوں کے مجلّہ کا انتخابی مواد، کتابی صورت میں پڑھنے والوں تک پہونچ جائے تو اسے بڑی علمی نعمت ہی کہا جائے گا اور زیرنظر کتاب ''مسرت کے ترانے'' بلاشبہ ایک ایسی ہی نعمت ہے، جسے جناب ضیاء الرحمٰن غوثیؔ نے ترتیب دے کر بڑوں اور خصوصاً بچوں کی بزم میں لایا ہے۔

آج سے تقریباً چالیس سال پہلے جب کہ بچوں کے رسائل ''کھلونا''، ''پیام تعلیم''، ''پھلواری''، ''غنچہ'' اور ''ٹافی'' کی اشاعت ہورہی تھی، جناب غوثیؔ نے اپنی ادارت میں پٹنہ سے ماہنامہ ''مسرت'' کا اجرا کیا تھا جس نے اپنے وقت میں خوب خوب شہرت اور مقبولیت پائی۔ زیرنظر کتاب اسی رسالے کی نظموں کا انتخاب ہے۔ کتاب کا سرورق، بچوں کی نفسیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ صفحہ ''انتساب'' کے بعد علقمہ شبلی کی تحریر ملتی ہے جس میں انہوں نے ''ماہنامہ مسرت سے ہفتہ وار مسرت تک'' کی روئیداد پیش کردی ہے اور بالکل درست لکھا ہے کہ اس وقت کے ''مسرت'' میں چھپنے والے آج کے بڑے قلم کار بن چکے ہیں۔ بعدازیں ''یادش بخیر'' کے تحت طلحہ رضوی برقؔ کے تاثرات اور ہدیۂ تبریک کے طور پر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریر ملتی ہے۔ مرتب کتاب جناب غوثیؔ نے کتاب کے نام ہی کو اپنی تمہیدی سطروں کا عنوان بناتے ہوئے ایک طرف پرانی یادیں تازہ کی ہیں تو دوسری طرف اپنے عزائم کا اظہار بھی کیا ہے۔ مزید برآں اس میں آل احمد سرور، سہیل عظیم آبادی، غلام سرور، وہاب اشرفی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد اور ڈاکٹر عبدالصمد کی تحریروں کے اقتباسات دیے گئے ہیں، جن سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے وقت میں یہ رسالہ بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

''مسرت کے ترانے'' دراصل ایک سو دو نظموں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۹ء تک کے ''مسرت'' کی فائل سے منتخب کی گئی ہیں۔ اس میں جہاں ایک طرف اقبالؔ اور صفیرؔ بلگرامی جیسے قدما اور اعجاز صدیقی، علقمہ شبلی، رعناؔ اکبرآبادی، شفیع الدین نیرؔ، آسیؔ رام نگری اور شبنم کارداری جیسے بیرون بہار کے شعرا کی نظمیں ملتی ہیں وہیں دوسری طرف مظہر امام، کلیم عاجزؔ، رضا نقوی واہیؔ، شبنمؔ کمالی، طلحہ رضوی برقؔ، ظہیر صدیقی، وفاؔ ملک پوری، رمزؔ عظیم آبادی، کیفؔ عظیم آبادی، بدرؔ عظیم آبادی، معینؔ کوثر، ذکی احمد، مولانا طٰہٰ کمال ندوی، محمد یونس ہرگانوی، سید شکیل دسنوی جیسے مشاہیر بہار اور فرحت قمر، پروین شیریں، سلمیٰ جاوید، نشاط آرا، عقیلہ خاتون اور رفعت آرا جیسی شاعرات کی نظمیں بھی موجود ہیں۔ گویا اس طرح یہ منظوم انتخاب ایک ''اجتماعی کاوش'' کا نمونہ بن گیا ہے اور اسی لحاظ سے مفید ومنفرد اور اہم بھی ہے، اس میں نہ صرف یہ کہ تصویری اہتمام کے ساتھ نظمیں شامل کی گئی ہیں بلکہ تھوڑی سی توجہ سے نہایت آسانی کے ساتھ اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ نظمیں بچوں کے مزاج، ان کی نفسیات اور ان کے مشاغل سے ہم آہنگ ہیں، ان میں حال و مستقبل کے تعلق سے بچوں کی ذہن سازی کا خاص خیال رکھا گیا ہے، یہاں ''کیا کروں'' اور ''کچھ نہ سمجھے خدا کرے'' جیسی پیروڈی بھی ہے اور ''مری توبہ، مری توبہ'' جیسی قوالی اور ''کوئل'' جیسی آزاد نظم بھی۔ یہاں دعائیہ، اصلاحی و اخلاقی، تعلیمی و پیامی اور قومی و فطری نظموں کے ساتھ ساتھ، بڑی تعداد میں ''چھینک''، ''رکابیہ''، ''مچھر خان''، ''مکھی بیگم''، ''کھٹمل شیخ''، ''چیلر'' اور ''چچا کی سائیکل'' وغیرہ

PDF Compressor Free Version

جیسی مزاحیہ نظمیں بھی ملتی ہیں۔ مزید برآں ''نانی کا پاندان'' اور ''عقلمند مسخرہ'' جیسی منظوم کہانیوں کے ساتھ ساتھ ''چیت''، ''بیساکھ'' اور ''ماگھ'' پر بھی موسمی نظمیں شامل ہیں۔ ''وقت کی قدر''، ''ترانہ اردو''، ''علم''، ''عبادت''، ''قومی ترانہ''، ''گڈا گڑیا''، ''شریر طالب علم کی دعا''، ''سال نو''، ''عید''، ''صبح کا نظارہ''، ''نماز''، ''ترکیب تتلی پکڑنے کی'' اور ''مداری وغیرہ جیسی نظمیں بتا دیتی ہیں کہ موضوعات کا ایک جہاں اس کتاب میں سمٹ آیا ہے۔ اگرچہ یہ بات درست ہے کہ اس کتاب میں ایک ہی نظم ''نماز'' ص ۲۷ کے بعد ص ۸۹ پر دوبارہ شامل ہوگئی ہے اور موضوع کی بنیاد پر نظموں کی تقسیم کا اہتمام نہیں ہوسکا ہے، پھر یہ کہ کتاب کی قیمت بھی کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ''مسرت کے ترانے'' کی ہمہ جہت اہمیت مسلم ہے اور اس بات کی مستحق کہ اسے بچوں تک پہونچنے کی سبیل بنتی رہے۔ ❁❁

ناصر کاظمی: کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی (ص ۱۴ سے آگے)

کیسی گردش میں اب کے سال پڑا
جنگ سر سے ٹلی تو کال پڑا

اگر سنجیدہ تقابلی انداز سے دیکھا جائے تو اس طرح صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلوب اور لہجہ اپنی جگہ، مگر اصلاً یہ وہ لہجہ نہیں ہے، جس سے ناصر کاظمی کی غزلوں کی عمومی شناخت قائم ہوتی ہے کیونکہ ان اشعار میں ناصر کاظمی نے محض اپنے عہد کے مسائل کو زبان دینے کی کوشش کی ہے۔ البتہ ناصر کے اسالیب کے تنوع کا یہ کرشمہ ضرور ہے کہ وہ محض ایک اسلوب پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اظہار کے مختلف پیرایوں پر قدرت رکھتے ہوئے اسے بروئے کار لاتے ہیں۔ شاید انہی اسباب کی بنا پر انہیں اردو ادب کا قاری فراموش نہیں کرسکتا اور جدید شاعری کے امام کے طور پر انہیں یاد کرتا ہے، ناصر بجا طور پر اپنے بارے میں یہ شعر کہتے ہیں۔

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفل سخن میں
ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

❁❁❁

سلام و پیام (ص ۷۲ سے آگے)

کے لئے مشتاق نوری صاحب کو صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مشتاق احمد صاحب کا مضمون بے حد دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اس شمارے میں ظفر حبیب صاحب نے ایک عمدہ جانکاری بہم پہنچائی ہے۔ ایک تو خواجہ میر درد تھے جن کا پہلا دیوان ہمارے سہسرام کے کیریہ لیتھو پریس سے شائع ہوا تھا۔ ''حسن خیال'' کے مطالعہ سے جی خوش ہوا۔ سید احمد قادری صاحب کا مضمون بھی فصیح و بلیغ ہے۔ شعری و ادبی سرقہ تو واقعی بڑی بددیانتی ہے۔ میں اس مقالہ کے لئے مقالہ نگار کو سلام پیش کرتا ہوں۔ میرا بھی ایک مطلع کئی لوگوں نے اپنے نام کرلیا جو قابل افسوس ہے مثلاً۔

مجھے یقیں ہے کسی فکر میں نہ ڈالے گا
خدا خدا ہے کوئی راستہ نکالے گا

میرے اس مطلع کو بھی سرقہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہیں ملی۔

اسی کو کہتے ہیں شاید مہان ہو جانا
زمیں پہ رہتے ہوئے آسمان ہو جانا

تازہ شمارہ کے تمام فکشن نگار مبارکباد کے مستحق ہیں۔ قلم کاروں کے بعد شعرا حضرات کا حق زینت شمارہ کہے جاسکتے ہیں۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی دعوت مطالعہ دیتا ہے۔ جمیل اختر شفیق صاحب نے کافی متاثر کیا۔ مشتاق نوری صاحب کی بہترین کارکردگی کے تعلق سے اپنا ہی ایک شعر عرض ہے۔

بہت آسان ہے تنقید کرنا
بہت دشوار ہے کچھ کام کرنا

اس میں شک نہیں کہ حکومت کی اردو نوازی خوب سے خوب تر ہے۔

شکیل سہسرامی، پٹنہ

☆ سب سے پہلے تو جنوری ۲۰۱۶ء کا شمارہ عنایت کرنے کا شکریہ ادا کروں پھر یہ لکھوں کہ ٹائٹل پیج سے لے کر ''سلام و پیام'' تک کے صفحے کو آپ نے جس حسن فن اور عرق ریزی سے سجایا اور سنوارا ہے وہ

(بقیہ ص ۶۸ پر)

PDF Compressor Free Version

ہماری سرگرمیاں

اکادمی کے زیر اہتمام دوروزہ عالمی اردو کانفرنس کا شاندار انعقاد

پٹنہ : بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام سہ روزہ خواتین اردو کنونشن کی مثالی کامیابی اور مقبولیت کے بعد، گزشتہ دنوں ۱۲، ۱۳ فروری کو، مقامی اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ میں، حسب اعلان دوروزہ عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا ''اردو زبان وادب: موجودہ عالمی تناظر'' کے موضوع پر منعقدہ اس تاریخی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وزیر محترم محکمہ اقلیتی فلاح حکومت بہار و کارگزار صدر بہار اردو اکادمی جناب عبدالغفور نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور آج کے حقائق کی روشنی میں ہمیں اپنی زبان کی ترقی کے لئے ٹھوس لائحہ عمل طے کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو مٹ گئی تو ہماری پہچان مٹ جائے گی۔ ہمیں دوسری زبان والوں سے سبق لینا اور اپنی زبان سے ہر حال میں ترجیحی محبت کرنا چاہئے۔ اردو کتابوں کے ناشرین کی یہ ذمہ داری ہے کہ اردو آبادی کی قوت خرید کا لحاظ رکھتے ہوئے مناسب قیمت پر اردو کتابیں بازار میں لائیں تاکہ بک اسٹال سے ان کی آسان نکاسی ہو سکے۔ ہمیں اردو کی ابتدائی اور پرائمری تعلیم کے فروغ پر خاص دھیان دینا ضروری ہے۔ حکومت اردو کی ترقی کے لئے پابند عہد ہے' یہ بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے اور حکومت کے ذریعہ ملنے والی سہولیات کا ہمیں بہتر سے بہتر استعمال کرنا چاہئے۔

پروفیسر اعجاز علی ارشد وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسیٹی و نائب صدر اکادمی نے اس کانفرنس سے اپنے استقبالیہ وتعارفی خطاب میں کہا کہ اردو کے تعلق سے عالمی تناظر میں ہمیں آج کی صورتحال کا بار بار جائزہ لینے اور نوجوانوں کو اس زبان وادب کی طرف رغبت دلانے کی ضرورت ہے۔ یہ کام بزرگوں کی سچی اعانت اور نوجوانوں کے لئے حوصلہ افزا اقدام کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔ ہمیں ماضی کے تناظر میں حال کا جائزہ لینا اور زبان کے سلسلے میں کسی بھی غیر فطری رویہ کی حوصلہ افزائی سے بچنا چاہئے۔ اس موقع پر اپنے خطاب میں پروفیسر ارتضی کریم نے زبان وادب کے تعلق سے گروپ ازم کی حوصلہ شکنی پر زور دیا اور کہا کہ اردو کی نئی بستیوں میں آج بہت سارے کام ہو رہے ہیں۔ ہمیں ترجیحی طور پر اردو کے مسائل کا حل ڈھونڈنا اور اس کے لئے احساس کمتری سے نکل کر، پورے اعتماد اور اتحاد کے ساتھ ٹھوس کام کرنا چاہئے۔ بنیادی ذمہ داری ہم اردو والوں کی ہے۔ ہمیں حلفیہ ذمہ داری کا احساس رکھے ہوئے غیر اردو داں آبادی کو، انفرادی اور اجتماعی توجہ کے ساتھ اردو سے آشنا بنانے اور ان میں اردو خواندگی عام کرنے کی کوشش میں کس طرح پیچھے نہیں رہنا چاہئے۔

اکادمی کی اس تاریخ ساز کانفرنس میں ملک کے مختلف علاقوں سے آنے والے ارباب قلم کے علاوہ متعدد بیرونی ممالک سے آئے ہوئے مہمانوں نے بھی شرکت کی اور اپنے خیالات سے نوازا۔ ایران کی محترمہ وفا یزدان منش نے اردو ادب کے حوالے سے، قدیم معاصرانہ ادبی چشمکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ بہر حال سود مند نہیں رہیں۔ انہوں نے اردو زبان کا خیال رکھنے پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ اردو ادب کی جڑ فارسی میں ہے اور آج کے ایران میں اردو کی تعلیمی صورتحال بہت بہتر ہے۔ وہاں جامعات سے لے کر متفرق علمی مراکز میں اردو کا مطالعہ ذوق وشوق سے ہو رہا ہے۔

ترکی سے تشریف لانے والے دانشور پروفیسر خلیل طوقار نے، کانفرنس کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے خسروؔ سے غالبؔ تک، اردو کی خدمت کرنے والے ان شعرا کو یاد کیا جو نسلاً ترک تھے۔ جناب خلیل نے کہا کہ اردو، مسلط کی ہوئی زبان نہیں، بلکہ اردو والوں کی اپنی زبان ہے۔ اردو اللہ کا احسان ہے۔ متعدد تاریخی شواہد اردو اور ترکی کی قربت ومحبت اور ان کے باہمی احترام کی کیفیتوں کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔ اردو اپنا خیال بھی رکھتی ہے اور اپنوں کا

PDF Compressor Free Version

خیال بھی رکھتی ہے اور نازک وقتوں میں زبان کے تحفظ کی ذمہ داری خواتین کے لئے بڑھ جاتی ہے۔ انہوں نے مثالیں دے کر کہا کہ تاریخ بتا رہی ہے کہ جب وقت آیا ہے تو خواتین نے حوصلے اور ذہانت سے تحریکی انداز میں زبان کے تحفظ کی راہ دکھائی ہے اور انہیں کامیابی ملی ہے۔ جناب خلیل نے بتایا کہ ترکی کی کئی یونیورسیٹی میں اردو پڑھائی جارہی ہے اور ترکی نے گزشتہ سال اردو تعلیم کی ایک صدی پوری کی ہے اور یادگار جشن اردو منایا ہے۔ امریکہ سے آئے ہوئے مہمان جناب ضامن جعفری نے کہا کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور زبان کا تحفظ اسے بولنے والوں کی پہلی اور آخری ذمہ داری ہے۔ موصوف نے ''ادب کی خدمت'' اور ''ادبی صورتحال'' کے زیرعنوان اپنے خاص لہجہ میں اپنی طنزیہ ومزاحیہ نظم سے بھی سامعین کو محظوظ کیا۔

نائب صدر اکادمی جناب سلطان اختر نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو پوری دنیا میں محوخرام اور ان گنت دلوں میں خیمہ زن ہے اور اردو کے مخالفین بھی اس کی عظمت وقوت کے معترف ہیں۔ انہوں نے شاعری کی زبان میں کہا کہ۔

لیتے ہیں اس کا نام بصد احترام اب　　اس کو گلے لگانے لگے خاص وعام اب
مقبول بے پناہ ہے بیرون ملک بھی　　سر چڑھ کے بولنے لگی اردو تمام اب

عالمی کانفرنس کے اس افتتاحی اجلاس میں حسب روایت شمع افروزی اور مہمانوں کے لئے گل پیشی بھی ہوئی اور انہیں مومنٹو اور اسناد سے نوازا گیا۔ اس موقع پر وزیر محترم کے ہاتھوں پروفیسر ارتضیٰ کریم، خواجہ اکرام الدین، غضنفر، انور پاشا، علیم صبا نویدی، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر جمیل اختر، ریاض عظیم آبادی اور جناب اشرف فرید وغیرہم کو ''اکادمی ایوارڈ'' دیئے گئے۔ عالمی اردو کانفرنس کی نظامت کے فرائض سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری نے انجام دیئے، انہوں نے کہا کہ بہت جلد ایک شاندار تقریب کا انعقاد کرکے اکادمی مزید ایوارڈ کی تقسیم کا عمل پورا کرے گی۔

عالمی اردو کانفرنس کے دوسرے دن تین اجلاس منعقد ہوئے پہلا اجلاس 10.30 بجے سے 1 بجے تک، دوسرا 2 بجے سے 4 بجے تک اور تیسرا 4 بجے سے 6 بجے شام تک' ان تینوں اجلاس میں ملک اور بیرون ملک کے مشاہیر کی ادبی نوازشیں جاری رہیں اور مقالہ خوانی وخطابات کے علاوہ شعرو شاعری کی محفل بھی آراستہ ہوئی۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت کے فرائض پروفیسر جاوید دانش اور کارداش زکائی نے انجام دیے اور پہلے دونوں اجلاس کی نظامت سکریٹری اکادمی نے فرمائی اور دوران نظامت جہاں اپنے آپ پر اعتماد کرنے، زبان سے محبت رکھنے اور اپنے معاشرے اور اپنی نسل کو اردو سے آشنا بنانے کی طرف توجہ دلائی وہیں اپنی بذلہ سنجی کی بے پناہ صلاحیتوں سے بھی حسب موقع کام لیا۔ پہلے اجلاس میں محترمہ نازیہ بیگم جافو نے اپنے مقالہ میں ''ماریشس میں اردو کے مسائل اور امکانات'' کی متنوع جہتیں اجاگر کیں اور موجودہ حالات میں ماریشس میں اردو کی ترقی کے لئے مختلف تجاویز کی طرف اشارے کیا اور کہا کہ اگرچہ وہاں بھی اردو تدریس وتعلیم کے بعض مسائل ہیں اور وہاں سے اردو کا کوئی اخبار ہنوز نہیں نکلتا، مگر وہاں اردو کے طلبا وطالبات کی تعداد بڑھ رہی ہے اور اردو کے تخلیقی ادب کی کتابیں بھی مختلف اصناف میں منظر عام پر آرہی ہیں۔ مجموعی طور پر وہاں اردو کا حال ومستقبل درخشاں ہے اور حکومت کی سرپرستی میں اردو کی ترقی جاری ہے۔

جناب مشرف عالم ذوقی نے موجودہ عالمی تناظر میں اردو زبان وادب کے تعلق سے کہا کہ اردو والوں کے سامنے تشخص اور تحفظ دونوں ہی کا مسئلہ ہے۔ انہوں نے تاریخ کے حوالے سے اردو کے روشن امکانات اور اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے اعداد وشمار کی روشنی میں اہم عصری احوال اجاگر کئے اور کہا کہ عالمی تناظر میں اردو کا مستقبل روشن ہے اور ہمارا ادب روز افزوں مقبولیت پا رہا ہے۔ ہم جدید تکنیکی تقاضوں کے ذریعہ اور انٹرنیٹ سے اردو کا مستحکم رشتہ بنا کر اسے مزید فروغ واستحکام دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں ترجمے کے فن پر بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ادب میں ایک سے بڑھ کر ایک فکشن لکھا جارہا ہے اور صارفیت کے دور کے مسائل نیز دیگر جدید عصری مسائل پیش ہورہے ہیں۔ اگر ہم اپنے تخلیقی ادب کا منصفانہ جائزہ لیں تو

PDF Compressor Free Version

کمتری کے احساس سے بہ آسانی نجات پاسکتے ہیں۔ جناب غضنفر نے اردو کی عصری صورتحال کو نہایت مرصع استعاراتی زبان میں کامیاب تدریسی وتجزیاتی انداز سے سامنے لایا اور حصول زبان کے اصل مقاصد بتاتے ہوئے کئی اہم مشورے دیے۔ انہوں نے اردو والوں کو تبلیغ زبان کے انداز میں کام کرنے کی طرف توجہ دلائی اور اردو کے جیالوں کی موثر تنظیم بنانے پر زور دیا۔ جناب غضنفر نے کہا کہ اردو کچھ مسائل کے حصار میں ضرور ہے، مگر اس کا حل کسی بھی طرح ناممکن نہیں۔ ہمیں اردو کے تعلق سے تدریسی، تنظیمی اور نصابیاتی کمزوریاں دور کرنے کے لئے موثر اقدام پر دھیان دینا چاہئے۔

اس موقع پر ایران کی محترمہ وفایزدان منش نے اپنے خطاب میں لسانیات کی تدریسی اہمیت اور اس کے تازہ علمی ونظریاتی فروغ پر توجہ دلائی اور ترویج اردو کے لئے آموزش اردو کے کام کی اہمیت وضرورت بتاتے ہوئے کہا کہ معاصر ادب کے متون اور حالیہ ادبی تحریک ورجحان پر کتابوں کی کمی دور ہونی چاہئے۔ محترمہ وفا نے ادب میں اثر پزیری کے اسباب کی گہری تلاش، معاصر ادب کے تقابلی مطالعہ اور خصوصاً کتاب شناسی کے علم کو بھی پوری طرح فروغ دینے کی بات کہی اور تدریسی زبان کے نفسیاتی رجحانات پر نظر رکھنے کا مشورہ دیا۔ جناب انور پاشا نے کہا کہ اردو کے فروغ وبقا، اس کے مستقبل اور اس کے تحفظ کا معاملہ خالصتاً برصغیر کا معاملہ ہے کسی بھی ملک میں اہم تقاضوں کی تکمیل کے لئے، بیرونی زبانوں کی تعلیم کا اہتمام ہوتا ہے، مگر اس کی ایک الگ حیثیت ہے۔ ملک کی تہذیبی شناخت میں اردو کا وسیع کردار رہا ہے۔ ہم اگر آج بھی اردو کو تہذیبی شناخت بنالیں تو ہماری محتاجی دور ہوجائے گی۔ جناب پاشا نے بہار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں اردو دوسری سرکاری زبان ہے یہ ریاست اردو کی سب سے بڑی منڈی ہے اور یہ بات ہمارے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے کہا کہ بات صرف مراعات کے حصول کی نہیں، اردو کا فروغ تو ہمارا جمہوری وآئینی حق ہے۔ ہمیں احساس کمتری سے نکل کر اردو کو اپنے معاشرے، اپنی زندگی اور اپنے گھر آنگن میں بنیادی طور پر پھیلانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مثالیں دے کر سمجھایا کہ بعض صورتحال خود ہماری بے اعتنائی اور احساس کمتری کی پیداوار ہے۔ ہماری خواتین میں تعلیم کا مسلسل فروغ بقائے اردو کی خاص ضمانت ہوسکتی ہے اور اس کے لئے ہمارے علما اور دانشوروں کو بھی تحریکی وتبلیغی انداز میں توجہ دینی چاہئے۔ جناب کارواش زکائی نے اپنے صدارتی خطاب کے دوران، اہل عظیم آباد اور اراکین اکادمی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ مشکلات ضرور ہیں، مگر محبان اردو کی کوئی کمی نہیں۔ کناڈا سے تشریف لانے والے مہمان پروفیسر جاوید دانش نے اردو کے تعلق سے کناڈا کی ادبی وصحافتی تاریخ اور عصری، نصابی اور تعلیمی ترقیات کا تذکرہ کیا اور مہجری ادب کی اہمیت بتائی۔ انہوں نے کہا کہ اردو سے زیادہ اہل اردو کا مسئلہ ہے کہ وہ تراجم اور دیگر طریقوں سے ادب کا سرمایہ بڑھائیں۔

دوسرے اجلاس کا آغاز وقفہ طعام کے بعد دو بجے دن سے ہوا۔ ڈاکٹر جمیل اختر نے اس موقع پر اپنے مختصر خطاب میں کہا کہ عملی اقدام سے ہی اردو کو اس کا سچا وقار مل سکتا ہے۔ انہوں نے بہار میں اردو تحریک کی تاریخی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے، کہا کہ ہمیں بہر صورت اپنی بے خبری وبے حسی دور کرنے اور اردو سماج میں بیداری لانے کے لئے قربانیاں دینے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد نے ''اردو زبان اور زندگی: عالمیت کے تناظر میں'' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا اور کہا کہ ہمیں عصر حاضر کے تقاضوں کے سمجھنے اور انہیں پورا کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مستند ماہرین لسانیات کے اقوال کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ زبان صرف ذریعہ اظہار ہی نہیں زندگی گزارنے کا پیمانہ بھی ہے اور ہمیں اردو میں ایسی قوت بڑھانے کی ضرورت ہے کہ عالمی بازار میں اس کی پکڑ مستحکم ہو۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے خواتین افسانہ نگاروں کے حوالے سے اردو زبان وادب کے موجودہ عالمی تناظر پر اپنے مقالے میں اجمالاً روشنی ڈالی اور کہا کہ فن ارتقا پزیر رویے کا نام ہے۔ اکیسویں صدی میں جدید تکنالوجی کی برکتوں سے ہمارے افسانوی ادب کے لئے بہت سارے مفید دروازے کھل چکے ہیں اور پرانے خدشات کے بادل چھٹ چکے ہیں۔ ڈاکٹر زرنگار یاسمین نے ''اردو شاعری کے موضوعات موجودہ عالمی تناظر میں'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور تنہائی، صارفیت اور دہشت گردی جیسے سہ گانہ کلیدی عصری موضوعات کی اردو شاعری میں فنکارانہ شمولیت پر مدلل روشنی

PDF Compressor Free Version

ڈالتے ہوئے کہا کہ مجموعی طور پر عالمی تناظر میں جو نئے موضوعات ابھرے ہیں ان کے متعلقات واثرات کو بالکل غیر جانبداری کے ساتھ ہمارے شعرا نے اپنے فکر وفن کے حصار میں لے لیا ہے۔ قطر سے آئے ہوئے مہمان ڈاکٹر شہاب الدین احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ دیگر باتوں کے علاوہ اقتدار اور جغرافیائی تحفظات بھی زبان کے معاملے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، لہٰذا اردو زبان وادب کو عالمی تناظر میں دیکھتے اور دکھاتے ہوئے ہمیں اسلوبیاتی لہجے کی باریکیاں سمجھنی ہوں گی اور فصیح وغیر فصیح کے روایتی دائرے سے نکل کر کسی تازہ تجزیاتی فیصلے تک پہونچنا ہوگا اور اس خاص مزاج کو بھی سامنے رکھنا ہوگا جو جمہوریت نے اردو کو عطا کیا ہے۔ انہوں نے باہمی روابط کے استحکام اور ادب فہمی وادب شناسی کا تازہ پیمانہ وضع کرنے پر زور دیا۔ جناب زین رامش نے اپنی پر مغز تحریر کے اشارات سے نوازتے ہوئے کہا کہ مغربی دنیا، غیر مغربی دنیا اور عرب امارات وخلیج میں اردو کا پھیلاؤ دراصل عالمی اردو ادب کی تین خاص جہتیں ہیں۔ اگر چہ نئی بستیوں میں تنقیدی، تاریخی اور تحقیقی ادب کی کمی کھٹکتی ہے، لیکن تخلیقی ادب اور خصوصیت کے ساتھ شاعری کے حوالے سے جو منظر نامہ سامنے آتا ہے وہ بہر حال اردو کے زندہ اور ارتقا پزیر زبان ہونے کا بین ثبوت ہے۔

ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے اپنے صدارتی خطاب میں اپنے جامع تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اردو کے تعلق سے کسی مایوسی میں مبتلا ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اردو نے صارفیت کے بل پر نہیں بلکہ ثقافت کی بنیاد پر دنیا کی سیر کی ہے اور نئی بستیوں میں اپنا وقار واعتبار بنایا ہے۔ انہوں نے رجائی پہلو پر نظر رکھنے کی ضرورت واہمیت بتائی اور کہا کہ ماتم ہونا چاہئے، مگر محاسبہ کے طور پر گلے شکوے کے طور پر ہرگز نہیں۔ اردو نہ ہوتی تو مشترکہ تہذیب نہ ہوتی، آج زمانے کے تقاضوں کو سمجھنے اور جدید تکنیکی سہولیات سے ہر طرح استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ زندہ زبان وہ ہے جو کثرت سے استعمال ہوا اور تازہ اعداد وشمار اور احوال اردو کی زندگی کا کھلا ثبوت ہیں۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنی صدارتی تقریر میں خوش فہمی اور یاسیت کے مابین فطری توازن بنائے رکھنے کا ذہن دیتے ہوئے بعض اہم نکات کی طرف اشارے کیا اور معاشرتی اور گھریلو زندگی میں عملی وعلمی طور پر اردو کو پروان چڑھانے کے مفید طریقے کو اپنانے اور اپنی کمزوریاں دور کرنے کے لئے کئی اہم باتیں یاد دلائیں۔ جناب شکیل احمد خاں نے اپنے مختصر خطاب میں اردو کی محفل میں آنے کے فوائد کا اعتراف کرتے ہوئے دوسری زبانوں کے شاہکار متون پڑھنے اور عملی طور پر اردو کے لئے بنیادی تعلیمی کام کرنے کی اہمیت بتائی۔ اس موقع پر جناب شکیل خاں کے دست مبارک سے جناب زین رامش، جناب مشرف عالم ذوقی، جناب انور پاشا، محترمہ زرنگار یاسمین، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، ڈاکٹر سید احمد قادری، جناب غضنفر، جناب علیم صبا نویدی، محترمہ نازیہ جافو، ڈاکٹر شہاب الدین اور جناب ظفر کمالی وغیرہم کے درمیان مومنٹو، سند اور اکادمی ادبی ایوارڈ کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔

دوسرے دن کے پروگرام کا تیسرا اجلاس ''شعری نشست'' کی صورت میں منعقد ہوا جس کی صدارت جناب سلطان اختر نائب صدر اکادمی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب صفدر امام قادری نے انجام دیے۔ اس نشست میں صدر مشاعرہ کے علاوہ جناب ظہیر انور، جناب زین رامش، جناب انور شمیم، جناب غضنفر، جناب ظفر کمالی، پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر علیم اللہ حالی، جناب ارمان نجمی، جناب علیم صبا نویدی اور بیرون ملک سے آئے ہوئے مہمان ڈاکٹر خلیل طوقار، جاوید دانش اور جناب ضامن جعفری نے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ اس موقع پر جناب ضامن کی نظموں ''مولوی صاحب جنت میں''، ''آپریشن فریڈم عراق'' اور ''نیا عالمی نظام'' کے علاوہ جناب جاوید دانش کی نظم ''صندلی صندلی سے موسم میں'' جناب ظفر کمالی کی نظم ''تشاعر'' اور جناب انور شمیم کی نظم ''کیوں ڈرامے ہو رہے ہیں'' بھی بہت شوق سے سنی گئی۔ حاضر ہے اس مشاعرے کی کچھ شعری سوغات۔

بے در و دیوار ہوں دیوار درد ہوتے ہوئے ڈھو رہا ہوں بے گھری میں اپنا گھر ہوتے ہوئے
باپ دادا کی انا زیر و زبر ہوتے ہوئے ہم نے دیکھا ہے حویلی کو کھنڈر ہوتے ہوئے (سلطان اختر)

PDF Compressor Free Version

مزاح و طنز کیا ہے یوں سمجھئے — مرے رونے پہ دنیا ہنس رہی ہے — (ضامن جعفری)
فقیری آج تک فطرت ہے میری — حویلی میں بظاہر رہ رہا ہوں — (جاوید دانش)
یار کے جلووں سے مری جاں میں پڑی آتش عشق — روح کو تڑپاتی ہے ہر دم مری یہ آتش عشق — (خلیل طوقار)
تبسم کو جتن کرنا پڑے گا — غموں کو بے وطن کرنا پڑے گا — (علیم صبا نویدی)
پسپائی آلودہ فضا میں گم ہیں — اکھڑے ہوئے خیموں کے خلا میں گم ہیں — (ارمان نجمی)
ہے غم ہجر نہ اب ذوق طلب ، کچھ بھی نہیں — آج تم لوٹ کے آئے ہو کہ جب کچھ بھی نہیں — (علیم اللہ حالی)
سر سبز موسموں کا اثر کیوں نہیں ہوا — پتھر تھا میں تو لعل و گہر کیوں نہیں ہوا — (اعجاز علی ارشد)
غیر سے لکھوا کے چھپوائی ہے اس نے جو کتاب — کر دیا ہے کس طرح اردو کا قیمہ دیکھئے — (ظفر کمالی)
یقین جانئے اس میں کوئی کرامت ہے — جو اس دھویں میں مری سانس بھی سلامت ہے — (غضنفر)
جھونکا ہوا کا چوم رہا ہے کلی کے لب — قائم جنوں کی گویا کہ بدعت ہوا سے ہے — (زین رامش)
تلخیاں لیتا چلوں ، رسوائیاں لیتا چلوں — یعنی اس کی قربتوں کے ارمغاں لیتا چلوں — (ظہیر انور)

سلام و پیام (ص ۶۳ سے آگے)

آپ کا ہی حصہ ہے۔ سچ مچ یہ شمارہ تو خواتین نمبر ہو کر رہ گیا، ان کے درمیان صرف ایک مرد کی صورت ہے پروفیسر اعجاز علی ارشد۔ یہ آپ نے اچھا کام کیا۔ نسیم سید کا مضمون ''شمالی امریکہ کے حقیقی باشندوں کی شاعری'' نہ صرف ان باشندوں کی شاعری، جذبات و احساسات سے ہمیں متعارف کراتی ہے بلکہ مقالہ نگار کی انسان دوستی کا بھی پتہ دیتی ہے۔ استحصال کی مخالف نسیم سید کا یہ جملہ ''سرد ہوا کے تھپیڑے کھا کر درخت بظاہر اپنی تمام ہریالی سے محروم ہو جاتے ہیں، لیکن.....'' ظاہر کرتا ہے کہ ان کے دل میں دبے کچلے لوگوں کے لئے کتنا درد ہے، ساتھ ہی آگے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے وہ مایوس نہیں۔ ''پارسا بی بی کا بگھار'' ذکیہ مشہدی کا ایک ایسا ناولٹ ہے جس پر ایک طویل مقالہ لکھنے کی ضرورت ہے، تین نسلیں اور ان کا جنریشن گیپ۔ ایک کا دوسرے سے قریب آنا پھر دور ہونا پھر قریب آنے کی کوشش کرنا ایک عجیب Confliets کی فضا پیدا کرتا ہے جو جذبات و احساسات کو ایک ایسی دنیا میں لے کر جاتا ہے جہاں فکر ہوا میں معلق ہے۔ آخر میں قمر اور رضوانہ کے آنسوؤں کا لگاتار بہنا اور ایک دوسرے میں گھل مل جانا، اشارہ ہے اس بات کا کہ نئی اور پرانی تہذیب دونوں میں سے کسی کو بھی انتہا پر نہیں جانا چاہئے۔ دوسری طرف عمران دونوں کے کرب سے بے خبر اپنے بچوں کو ایک جادوئی دنیا میں لے جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جو روایتی بھی ہے اور جدید بھی۔ الماس شبی کا یہ شعر بہت پسند آیا۔

لاکھ تجھ سے ہے اختلاف مگر
دل ترا احترام کرتا ہے

بدنام نظر، شیخ پورہ

☆ آپ کی ادارت میں ''زبان وادب'' نے جو شکل و شباہت، صورت و سیرت اختیار کی ہے، پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔ آج اردو ادب کے بڑے رسائل کے مدیران بھی اس رسالہ کو رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہوں گے یہ مبالغہ آرائی نہیں ہے بلکہ ہر قاری کے دل کی آواز ہے۔ مشمولات میں کوئی تخلیق گراں بار نہیں ہوتی۔ اداریہ میں ہر تخلیق کے تعلق سے آپ کا مختصر تبصرہ قاری کے اندر ذوق و شوق اور تخلیق کار میں مزید تحریک پیدا کر دیتا ہے۔ یقیناً بہار و جھارکھنڈ کی ادبی فضا کو ساز گار بنانے میں آپ کی ادارت نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ آپ سے

(بقیہ ص ۷۸ پر)

PDF Compressor Free Version

سلام و پیام

☆ پیارے نوری! لگ بھگ پینتالیس برسوں سے ادب کی خدمت کرتے ہوئے خونِ جگر صرف کر رہا ہوں، لیکن کبھی مجھے ''زبان و ادب'' پرچے کی کمپلمنٹری کاپی نہیں فراہم کی گئی۔ تم پہلے سکریٹری ہو جس نے مجھے لائق اعتنا سمجھا اور بذریعہ ڈاک مارچ ۲۰۱۹ء کا شمارہ بھجوایا۔ بہت دیر تک پرچے کے ٹائٹل کو دیکھتے ہوئے لطف اندوز ہوتا رہا۔ چمکتی ہوئی عمودی روشن لکیروں نے ٹائٹل کور کے ڈیزائن کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ تمہارا نثری نظم نما اداریہ قابل ستائش ہے، مری جانب سے مبارکباد قبول کرو۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ دوست ہوتے ہوئے بزرگ کی طرح دعا دے رہا ہوں۔ مقالوں میں ڈاکٹر افصح ظفر کے مضمون کا جواب نہیں۔ نورالحسنین کی کتاب ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' پر اپنے دوست ڈاکٹر حسین الحق کا مضمون لائق مطالعہ ہے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ حسین کے یہاں تنقیدی بصیرت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ رئیس انور اور ارشد اقبال کے مضامین بھی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ افسانوں میں م۔ ناگ کا افسانہ دیرپا تاثر قائم کرتا ہے۔ وہ بھی میری طرح ''سن ستری'' نسل کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ ابوبکر عباد کا افسانہ اچھا ہے۔ سید محمد جلیل کا طنز و مزاح ''اڑے غالب کے پرزے'' پسند آیا۔ مجموعی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس خوبصورت پودے کی آبیاری امتیاز احمد کریمی نے اپنی ذہانت اور جانفشانی سے کی، تم اسے مہمیز لگا کر تناور درخت بنانے کی کوششوں میں مستغرق ہو اور آگے کی طرف گامزن۔ مری جانب سے پرچہ بھجوانے کے لئے ایک بار پھر شکریہ! پرچہ ہر اعتبار سے معیاری ہے۔ اس کے لئے وزیر اقلیتی فلاح ڈاکٹر عبدالغفور اور دیگر رفقا بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شوکت حیات، پٹنہ

☆ بہت پہلے بھی رسالہ ''زبان و ادب'' دیکھا تھا، تب نہ ایسا گٹ اپ تھا اور نہ ہی ایسی خوبصورتی تھی، لیکن جب سے آپ کی ادارت میں یہ رسالہ آیا ہے، سرورق سے لے کر اندر کا ایک ایک صفحہ آپ کے احساس جمال اور آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کی داد وصول کر رہا ہے۔ اس وقت میرے سامنے ماہ مارچ ۲۰۱۹ء کا شمارہ ہے۔ اس شمارے کا سرورق صرف خوب صورت ہی نہیں ہے بلکہ معنی کی کئی جہتیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ایک طرف یہ زندگی اور موت کے فلسفے کو پیش کر رہا ہے تو دوسری طرف ناگفتہ بہ حالات سے انسانی جدوجہد اور حوصلے کا علامتی اظہار بھی ہے۔ آپ نے اداریہ کو ایک نئے انداز سے نثری نظم کے قالب میں ڈھالا ہے اور پورے خلوص کے ساتھ ملک کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے قلمکاروں کو جس بات کی دعوت دی ہے بلکہ جس احساس کو جگایا ہے وہ قابل تعریف ہے: ''قلم کارو، ساہتیہ کارو/ آؤ کہ اب بردیش کو تمہاری ضرورت ہے/ اس ڈرامے میں سب سے اہم ربھومیکا تمہاری ہے/ تمہارا قلم ہی للکار ہے/ تمہارا قلم ہی تلوار ہے/ آؤ اپنی تلوار سے/ خود کو زخم لگاؤ/ محبت کے پھول کھلاؤ/ کہ آج دیش کو تمہاری ضرورت ہے'' آج ادب سے یہ نقشہ بدلے گا یا نہیں؟ ویژن میڈیا کا مقابلہ کر پائے گا یا نہیں؟ یہ سوالات اپنی جگہ، لیکن ہمیں اپنی موجودگی اور اپنی ذمہ داریوں سے منھ نہیں موڑنا چاہیے۔ اندھیرا خواہ کتنا ہی گہرا ہو، ہمیں آواز تو دینی ہی چاہیے۔ اس بار مضامین لطف دے گئے۔ پروفیسر افصح ظفر نے احمد صغیر کے فن پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ بھائی حسین الحق نے میرے ناول پر مختصر مضمون لکھا، لیکن جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سب قابل قبول ہیں۔ بہار میں اردو افسانہ نگاری پر پروفیسر رئیس انور نے بہت محنت سے اور اپنے عمیق مطالعے کی روشنی میں لکھا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اردو افسانے کو کل بھی اور آج بھی ریاست بہار ہی نے بڑے بڑے نام دیئے ہیں، اور اپنی جرأت مخلصانہ کے سبب دیگر ریاستوں کے افسانہ نگاروں کی بھی قدر کی ہے۔ اس مضمون میں کچھ نام چھوٹ گئے ہیں ویسے بھی کسی ایک مضمون میں سب کے فن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک بھرپور مضمون ہے۔ ذوقی ہمارے عہد کا ایک نہایت فعال قلم کار ہے۔ سیمیں کرن نے

PDF Compressor Free Version

ناول ''آتش رفتہ کا سراغ'' کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔اس ناول کا موضوع یقیناً ذوقی کی جسارت کی داد طلب کرتا ہے۔رسالے کا افسانوی حصہ، م۔ناگ، منزہ احتشام گوندل، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر ریاض توحیدی اور ابن عاصی سے سجا ہوا ہے جو قائین کو اُداس آدمی نہیں بناتا۔خواتین کے سہ روزہ قومی کنونشن کی رپورٹ پڑھ کر بے اختیار زبان سے نکلا کاش دیگر اکادمیاں بھی اس قدر عمدہ پروگرام منعقد کریں۔آپ کی کارکردگی اور سیکریٹری شپ قابل تقلید ہے۔اب ''زبان وادب'' کے اگلے شمارے کا انتظار ہے۔

نورالحسنین، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

☆ ''زبان وادب'' فروری ۲۰۱۶ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔آپ نے اس میں خوشگوار تبدیلیاں کی ہیں۔آپ کی ادارت میں ہر شمارہ اس کی نشاندہی کرتا ہے۔نئی بستی (اردو کی نئی بستی) کے قلم کاروں کو آپ زیادہ سے زیادہ جگہ دے رہے ہیں۔ہندی افسانوں کے ترجمے جگہ پا رہے ہیں جنوری کا شمارہ تو لسانی ادب کا ترجمان ہوگیا ہے۔غرض کہ رسالے کو آپ نئی جہتوں سے روشناس کرا رہے ہیں۔تازہ شمارے میں ڈاکٹر مشتاق احمد، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاکٹر سید ارشد اسلم کے مقالات بہت پسند آئے۔نورالحسنین کا افسانہ ''بیچ بھنور ندیا گہری'' کا تاثر دیر تک قائم رہے گا۔کاش اس افسانے کے انجام کے مطابق ہمارے ملک کا موجودہ ماحول بھی ہوجائے۔اس وقت تو عدم رواداری کو راہ مل گئی ہے اور قوم پرستی کے معنی ہی بدلتے جا رہے ہیں۔حب الوطنی کے پیمانے بدل گئے ہیں بس ایک ہی نظریہ حاوی کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔شنکر کیموری کی حمد پاک اور نعت شریف بہت پسند آئے۔غزلوں میں شہپر رسول اور سلیم انصاری کی مختلف تخلیقات متاثر کرتی ہیں۔

مہدی پرتاب گڈھی، پرتاب گڈھ

☆ مارچ ۲۰۱۶ء ماہ کا شمارہ حسب معمول خوبصورت سرورق اور اعلیٰ مضامین کے ساتھ منظر عام پر ظہور پذیر ہوا ہے۔اس میں شائع تمام مضامین اس جریدہ کے قبل قائم کئے گئے معیار کے بموجب ہی ٹھہرتے ہیں۔نور الہدیٰ سید کا افسانہ ''محبت محزون'' اپنے ملک کی خاطر اپنی جان نثار کرنے والے فوجی افسر کی لائق تقلید داستان پر مبنی ہے۔ایک دم ''اجنبی'' ہونے کے باوصف اس کی قربانی میں اس کے تئیں اسٹوری نیریٹر ''میں'' کی ہمدردی بھی جو عشق کی حد تک جاتی ہے، وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی سہیلی ناصرہ کے دل میں نہفتہ عشق کے شعلے سے بھی وابستہ دکھائی جا سکتی تھی۔افسانے کے اختتام پر دھاڑیں مار مار کر رونے والا ردِعمل اُس کا بھی ہوسکتا تھا۔م۔ناگ صاحب کے فلسفیانے انداز میں رقم افسانے ''اکیلے مکان کا اداس آدمی'' میں عنوان کا اعادہ صدائے بازگشت کی مانند نہایت بامعنی ہوتا رہتا ہے۔انگریزی افسانوی کی طرح سے اس کا Open End اس فنی ہیئت کا ایک بہترین نمونہ ثابت ہوتا ہے۔منزہ احتشام گوندل کے افسانے ''کمر سے کمرے تک'' میں مکمل آزادی کی متمنی عورت کی ذہنیت کے ساتھ قدیم وجدید نسلوں کے تفرق کو بھی بخوبی نشان زد کیا جا سکا ہے۔ڈاکٹر ابوبکر عباد کے افسانے ''کون سی الجھن کو سلجھاتا تھا وہ'' میں ہیرو بدعت اللہ شاہ کی اول تا حیات بے چینی و بیکسی بالآخر اس کی اذیت ناک وفات قاری کے لیے متعدد سوالات چھوڑ جاتی ہے۔افسانہ نگار کے دیگر افسانوں کی مانند اس میں بھی کردار نگاری کے عروج کو قائم کیا گیا ہے۔ڈاکٹر ریاض توحیدی کے افسانے ''زہر آب'' کے تحت چند برس قبل فردوس موسوم سرینگر میں تباہی و ابتری لانے والے سیلاب کا گویا چشم دید حال بیان کیا گیا ہے اور مناظر کی حقیقت آمیز تصویر کشی قابل تعریف ہے۔انگریزی و ہندی زبان کے الفاظ کا جا بجا تصرف موزونیت و مناسبت لیے ہوئے ہے اور اسے افسانے کے ایک Plus Point سے عبارت کیا جا سکتا ہے۔سید محمد جلیل صاحب نے ''اڑے غالبؔ کے پرزے'' میں ایک نایاب موضوع کے ساتھ کاملاً انصاف کیا ہے۔اس میں از حد معقول اشعار محولہ ہوئے ہی ہیں، مستزاد کسی شاعر کے بقید حیات ہی بعد از مرگ کے تخیلی مشاہدات کی عکاسی قابل مدح ہے۔احمد فرازؔ کا ایک شعر تھا۔

شعلہ تھا جل بجھا ہوں، ہوائیں مجھے نہ دو
میں کب کا جا چکا ہوں، صدائیں مجھے نہ دو

اب اس مقالے میں محولہ اسی مفہوم سے مشابہت رکھنے والے اشعار سے موازنہ کر کے محظوظ ہوں۔اسی طرح ذوقؔ کا ایک شعر تھا۔

PDF Compressor Free Version

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا، خدا مغفرت کرے

اس شعر کا محرک غالبؔ کا یہ شعر ہو سکتا ہے ۔

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مرزا غالبؔ کی شاعری کا ہمہ گیر اثر کتنے ہم عصر و متاخرین شعرا پر پڑا، یہ قابل تحقیق ہے، یہ امر و حقیقت درخور توجہ و لائق ستائش گردانی جائے گی۔

کرشن بھاوک، پٹیالہ، پنجاب

☆ ''زبان و ادب'' شمارہ فروری ۲۰۱۶ء زیر نظر ہے۔ حسب دستور رسالے کے معیار کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ''بہار میں جدید اردو غزل آزادی کے بعد'' سے متعلق ڈاکٹر مشتاق احمد کا مضمون پڑھا۔ شعرا کی فہرست میں کچھ غیر ضروری نام شامل کر لئے گئے ہیں جو کسی ادبی رسالے میں نظر نہیں آتے ہیں نہ ہی ان کی تادم تحریر کوئی ادبی شناخت ہی ہے اور کچھ اہم نام چھوڑ دیے گئے ہیں۔ میرے خیال میں جدید اردو غزل کا دائرہ مزید وسیع کرتے ہوئے اکیسویں صدی تک احاطہ کرنا چاہئے، کیونکہ آئے دن نئے انقلاب رونما ہو رہے ہیں۔ شاعری کا لب و لہجہ بھی بدل رہا ہے۔ نئی نسل ابھر کر سامنے آ رہی ہے، لہٰذا جدید اردو غزل کو نئے تناظر میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سید ارشد اسلم کا مضمون ''اردو میں شعری و ادبی سرقہ'' بھی معلوماتی ہے۔ گرچہ آج کل سرقے کا مفہوم بدل گیا ہے۔ مضمون کا سرقہ سرقہ نہیں کہلاتا ہے۔ ہو بہو کسی شاعر کا شعر نقل کر لینا یا پھر شعوری طور پر کسی شعر کے چند لفظوں کو الٹ پھیر کر اپنے نام منسوب کر لینا سرقہ کہلانے لگا ہے۔ ''سلام و پیام'' کے تحت مراسلے خاصے دلچسپ اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ نیز بحث و مباحثہ کے در وا کرتے ہیں، لیکن بعض مراسلے تعریفی ہوتے ہیں، ''جس میں حوصلہ افزا ہے''، ''جی خوش ہو گیا''، ''قابل تعریف ہے''، ''خوشی ہو رہی ہے'' وغیرہ وغیرہ جملے ہوتے ہیں، جس سے قاری کا ذہن پراگندہ ہوتا ہے۔ * ''زبان و ادب'' جنوری اور فروری ۲۰۱۶ء میں ''اپ ہرن'' کے تعلق سے جمیلہ بی بی کا تجزیہ اور کرشن بھاوک کا خط بھی پڑھا۔ کرشن بھاوک نے ''اپ ہرن'' کا لغوی معنی استحصال حاصل کرنا وغیرہ بتایا ہے جو صحیح ہے، لیکن ''اپ ہرن'' میں استحصال بالجبر یعنی زبردستی حاصل کرنے کا عمل بھی ہے۔ ''اپ ہرن'' میں حق تلفی کا بھی عمل ہے۔ کرشن بھاوک جی نے ''اپ ہرن'' کا عنوان استحصال بتایا ہے، لیکن میری سمجھ سے کہانی کا عنوان ''اپ ہرن'' ہی مناسب ہے، چونکہ استحصال بالجبر اور حق تلفی کے ساتھ Criminally conspiracy مجرمانہ سازش بھی ہے۔ گل افشاں حیدر کے مراسلے کے آخری جملے قابل توجہ ہیں۔

جنوںؔ اشرفی، چھوٹی کھگول

*آپ غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تعریفی کلمات جھوٹے ہیں ان سے پرہیز کرنا چاہئے؟ یا پھر یہ کہ رسالہ تعریف کے قابل ہے ہی نہیں۔ (ادارہ)

☆ ''زبان وادب'' مارچ ۲۰۱۶ء ملا۔ حسب عادت سب سے پہلے ''سلام و پیام'' پڑھا۔ خالد عبادی کا خط ''ناشادؔ..... کب سے شاعر ہو گئے؟ باتیں اور بھی ہیں.....'' اور عبادی کے خط کی تائید میں خود ناشادؔ کی غزلیں جلوہ افروز ہیں، اس پر طرہ ''زبان وادب'' کی پھلواری میں اکیاون ہزار گلہائے رنگا رنگ کھلائے گئے ہیں * اس بے نظیر ترتیب و تزئین کے لئے ارادہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ بادی النظر میں دیدہ زیب سرورق دیکھ کر دل شاد ہو جاتا ہے۔ فکر کیا تو کھلا کہ اکادی کی صورت حال کی اس سے بہتر ترجمانی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ مصور نے برسوں قبل وہ سب کچھ دیکھ لیا تھا جو اب رونما ہوا۔ آپ کے حسن انتخاب کی داد دینے کو جی چاہتا ہے، ویسے بھی ان دنوں اکادی میں علمائے شعر و ادب کا اجتماع ہے، جس کی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ مقالات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سید محمد جلیل نے غالبؔ کے خوب پرزے اڑائے ہیں ع

وہ تو چپ ''ہے'' کہ پان ہے منھ میں

منیر سیفی، پٹنہ

* انشاء اللہ یہ گل آفتدہ سال بھی کھلے گا (ادارہ)

☆ رسالہ ''زبان وادب'' کا برسوں سے پرستار رہا ہوں۔ جب کبھی یہ رسالہ کسی لائبریری یا کسی شناسا کے یہاں نظر نواز ہوا اس کے مشمولات نے متاثر کیا۔ تزئین، کمپوزنگ اور طباعت عمدہ اور معیاری

PDF Compressor Free Version

ہیں۔مارچ کے شمارے کا سرورق بہت ہی دیدہ زیب ہے۔کلکتہ جیسے شہر میں اس عمدہ رسالے کو کسی بھی بک اسٹال پر نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ ایسی کوئی سبیل نکالیں کہ یہ رسالہ کلکتہ والوں تک بھی پہنچ سکے۔آپ کا رسالہ پابندی سے ہر ماہ قارئین تک پہنچ رہا ہے، بڑی بات ہے۔ مارچ ۲۰۱۶ء کے ''بچوں کا زبان و ادب'' میں میرا مضمون ''عظیم طبیب: الرازی'' آپ نے شائع کیا، شکریہ! اس شمارے میں آپ کا منظوم اداریہ ''حرف آغاز'' دعوتِ فکر دیتا ہے۔رئیس انور صاحب کا مضمون ''بہار میں اردو افسانہ نگاری: پچھلے پچاس برسوں میں'' تحقیقی ہوتے ہوئے بھی تشنگی کا احساس دلاتا ہے۔''منٹو کی جنسی معنویت'' میں ڈاکٹر ارشد اقبال نے منٹو پر چسپاں کیے گئے جنسی لیبل کو ادھیڑنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔افسانوں میں کشمیر سے ڈاکٹر ریاض توحیدی کا افسانہ ''زہر آب'' کشمیر میں گزشتہ سال آئے سیلابی قہر کا بھرپور ترجمان ہے۔محسوس ہوتا ہے قاری کوئی فلم دیکھ رہا ہے۔عادل جیسے جیالوں کی ملک وقوم کو اشد ضرورت ہے۔کم صفحات میں ''بچوں کا زبان وادب'' کے معیار اور ترتیب کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔دیگر مشمولات میں ''کتابوں کی دنیا''۔''ہماری سرگرمیاں'' اور ''سلام و پیام'' بھی اچھے لگے۔زبان وادب کی پوری ٹیم کو بہت بہت مبارکباد۔

سید محفوظ عالم، کلکتہ

☆ کچھ عرصہ پہلے سے میں نے ''زبان وادب'' خریدنا بند کر دیا تھا۔ اس لئے کہ اس کا معیار گرتے گرتے اتنا گر گیا تھا کہ اس میں شامل مواد سے نہ کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا، نہ اس کے مطالعہ سے عہد حاضر کے تخلیقی ادب کی سمت و رفتار کو ہی سمجھا جا سکتا تھا۔اب اس نے آپ کی ادارت میں پھر سنبھالا لیا ہے اور علاقائیت سے نکل کر پورے عالم کو سمیٹنا شروع کر دیا ہے، جو رسالہ اور قاری دونوں کے لئے نیک فال ہے۔ان کوششوں کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔تازہ شمارہ مارچ ۲۰۱۶ء (ج ۳۷، ش ۳) اپنے اداریہ کے سبب کچھ زیادہ ہی معنی خیز اور بھاری بھرکم ہو گیا ہے۔نثری نظم کے پیرائے میں اپنی بات کہنے کا انداز اچھا لگا، جو چونکاتا بھی ہے اور یک گونہ مسرت کا احساس بھی پیدا کرتا ہے، جس کے ذریعہ ملک کی انتہائی المناک صورت حال بھی سامنے آتی ہے اور قلم کاروں کے لئے ایک پیغام بھی نشر ہوتا ہے۔دیگر مشمولات بھی قابل مطالعہ ہیں۔رسالہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی نکھر کر سامنے آیا ہے، لیکن انتخاب میں کچھ اور بھی مدیرانہ سختی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

انور شمیم، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' مارچ ۲۰۱۶ء کا شمارہ موصول ہوا۔اس بار آپ کے اداریے کا لب ولہجہ بھی ذرا مختلف ہے۔یہ انداز بھی کافی اچھا لگا، آپ نے اداریے کے ذریعہ جو پیغام دیا ہے بلاشبہ آج اس کی اشد ضرورت ہے۔آج کے ماحول میں اقلیتی طبقہ کے ساتھ جو ناروا سلوک دیکھنے کو مل رہے ہیں۔یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ایسے میں اخوت، بھائی چارگی، محبت اور مروت کے ذریعہ ہی دلوں کے زخم کو مندمل کیا جا سکتا ہے۔اس شمارے کے مشمولات میں ''اردو افسانہ نگاری''، ''منٹو کی جنسی معنویت'' اور ''آتش رفتہ کا سراغ: ایک مطالعہ'' بہت پسند آئے۔ابن عاصی کا افسانچہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔منظومات میں منیر سیفی صاحب کا ''تاریخ وصال انتظار حسین'' اور ''مجھے آواز دے لینا'' کا جواب نہیں۔اکادمی کے زیر اہتمام سہ روزہ خواتین اردو قومی کنونشن کے انعقاد کی روداد پڑھی۔اس نوعیت کا غالباً یہ پہلا کنونشن ہے جو آپ کی سرپرستی میں منعقد ہوا۔واقعی قلیل مدت میں آپ نے برسوں کا کام کر دیا ہے۔آپ کے یہ کارنامے سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔خدا آپ کے حوصلوں کو مزید جلا بخشے۔

ارشد قمر، ڈالٹین گنج

☆ سرسبز و شاداب اور انتہائی دیدہ زیب گردش کرتی ہوئی عمارت کا سروق لئے فروری ۲۰۱۶ء کا ''زبان وادب'' پیش نگاہ ہے۔مدیر جریدہ کا ''حرف آغاز'' پڑھ کر تعجب ہوا۔اس اداریے میں وہ تمام باتیں ہیں جو دو روزہ عالمی اردو کانفرنس میں لوگوں نے اپنے مقالات کے حوالوں سے پیش کیں جب کہ کانفرنس بعد میں ہوئی ہے اور مشتاق احمد نوری صاحب نے اداریہ پہلے لکھا ہے مجھے تو یہ بھی کوئی آسیبی معاملہ معلوم پڑتا ہے۔اداریہ بہت اچھا اور حوصلہ افزا ہے، میں اس

(بقیہ ص ۶۳ پر)

PDF Compressor Free Version

بچوں کا

زبان وادب

☆	دعائے خیر	قیصر صدیقی	۷۴
☆	مشینی انسان: روبوٹ	ظفر سلطان	۷۵
☆	آوازوں کی آلودگی	درخشاں جبیں	۷۷
☆	لفٹ کی سیر	شاہ زماں حق	۷۹
☆	رکشہ والا	م۔ آصف آروی	۸۰

PDF Compressor Free Version

قیصر صدیقی

Vill. Qaisara Abad Nawada, P.o. Kheraj Jitwarpur
Dist- Samastipur 848134

دعائے خیر

دے اللہ ، خوشحالی دے　　کھیتوں کو ہریالی دے
نیلم جیسے پتے دے　　ہیرے جیسی ڈالی دے
موتی جیسے دانے دے　　سونے جیسی بالی دے
اجلے دن دینے والے　　راتیں کالی کلی دے
نیکی والا رزق کھلا　　عزت والی تھالی دے
تیرے پھول ، تیری مرضی　　خوشبو دے ، یا لالی دے
مظلوموں کو گلے لگا　　ظالم کو پامالی دے
تیری عنایت کے صدقے　　ہمیں بھی کوئی والی دے
سن لے پھولوں کی فریاد　　اس گلشن کو مالی دے
یا اقبالؔ کو پیدا کر!　　یا مولانا حالیؔ دے
سر کو بنا شبیرؓ ادا　　دل کو سوزِ بلالیؔ دے
اور ہمیں اب خوار نہ کر　　پھر سے رتبہ عالی دے

قیصرؔ جی کی کویتا کو
ہر انداز مثالی دے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ظفر سلطان
203 Gulistan Apartment, SultanGanj, Patna.800006 (Mob. 9334390268)

مشینی انسان: روبوٹ

قدرت کی مینا کاری کا مطالعہ کرنا اور پھر اس میں موجود کسی چیز کی نقل اتارنا انسانی فطرت میں شامل ہے۔ پرندوں کی پرواز سے متاثر ہو کر انسان نے ہوائی جہاز کی ایجاد کر لی۔ انسانی آنکھوں کا مطالعہ کیا تو فوٹو کیمرہ بنا لیا اور پرندوں کی چونچ اور اس کی گرفت کا راز جانا تو طبی سائنس میں بہت سارے جراحی کے اوزار بنا ڈالے۔ اسی طرح انسان کے اندر اپنے جیسا انسان بنا لینے کی خواہش بھی ہمیشہ سے رہی ہے۔ وہ مٹی کا پتلا اور پتھروں کا مجسمہ بناتا رہا اور کاغذوں پر شکل وصورت اتارتا رہا، لیکن اپنی محدود عقل وقوت کی بنا پر ایک سوچنے سمجھنے والا انسان اب تک تو نہیں بنا سکا ہے، لیکن اس سائنسی دور میں انسان نے جو کچھ بنایا ہے اس کا نام "روبوٹ" ہے۔

روبوٹ (Robot) ایک ایسی مشین ہے، جو انسان کی طرح بہت سارے کام کر سکتی ہے، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس مشین کی شکل بھی انسان کی طرح ہی ہو۔ اس کے ہاتھ یا پیر ہو سکتے ہیں اور کبھی کبھی تو دو ہاتھ کی جگہ تین یا زیادہ ہاتھ بھی ہو سکتے ہیں، جس کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ روبوٹ کس کام کے لئے بنایا گیا ہے۔

"روبوٹ" لفظ کا استعمال سب سے پہلے ۱۹۲۰ء میں چیکو سلاواکیہ کے مشہور ڈرامہ نگار کارل کاپیک (Karelcapek) نے اپنے ایک ڈرامہ "روسس یونیورسل روبوٹس" میں کیا تھا۔ یہ لفظ چیک زبان کے "روبوٹا" سے لیا گیا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے "بندھوا مزدور" بہت حد تک روبوٹ ایک بندھوا مزدور ہی ہے۔ وہ ہماری خواہش کے مطابق ایک بندھوا مزدور کی طرح بغیر کسی ہچک اور روکاوٹ کے لگاتار کام کرتا رہتا ہے۔ انسان کی طرح نہ تو وہ ہڑتال پر جاتا ہے اور نہ ہی نعرے بازی میں حصہ لیتا ہے۔ بس حکم کی دیر ہے کہ اشارہ ملتے ہی یہ اپنے کام انجام دیتا ہے۔

آج کل الگ الگ کام کے لئے طرح طرح کے روبوٹ بننے لگے ہیں۔ کارخانوں میں کام کے لئے صنعتی روبوٹ وجود میں آچکے ہیں۔ یہ کئی ایسے کام کر سکتے ہیں جنہیں طاقت ور سے طاقت ور آدمی بھی اپنی انسانی حدود کی بنا پر نہیں کر سکتے۔ مثلاً روبوٹ آسانی سے لوہے کی تپتی ہوئی چھڑ کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتے ہیں، جب کہ انسان کے لئے ایسا کرنا ناممکن ہے۔ اسی طرح عام طور پر ایک آدمی چھ سات گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر سکتا ہے، لیکن روبوٹ بغیر تھکے ہارے کافی چستی اور تیزی کے ساتھ زیادہ دیر تک کام کر سکتا ہے۔ معاشی نقطہ نظر سے بھی یہ دوسری مشینوں کے مقابلے میں کافی فائدہ مند ہے۔

روبوٹ کا استعمال مشینوں میں پرزے لگانے اور اس میں سے پرزوں کو باہر نکالنے، پینٹ کرنے، موٹر گاڑیوں کے ڈھانچوں کو ویلڈ کرنے یعنی جوڑنے، سامان چڑھانے اور اتارنے، ٹریکٹر کے پرزوں کو تپانے اور اسی طرح کے کئی دوسرے کاموں میں کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ نہایت ہی گرم اور زہریلے ماحول میں جہاں کہ انسان کا کام کرنا ناممکن ہے، وہاں ان روبوٹ سے بخوبی کام لیا جا سکتا ہے۔

ٹوکیو (جاپان) میں پرائمری اسکول کے طلبا وطالبات اپنی روبوٹ ٹیچر کو چھوتے ہوئے (تصویر بشکریہ I Next پٹنہ)

PDF Compressor Free Version

صنعتی روبوٹ کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ روبوٹ ایسے ہیں جنہیں آسانی سے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھا جا سکتا ہے۔ ان سے چھوٹے چھوٹے کام لیے جاتے ہیں، جیسے کہ مشین کے پرزے کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنا۔ ان میں ہائیڈرولک موٹر لگے ہوتے ہیں۔ کچھ روبوٹ ایسے ہوتے ہیں جن کا وزن بہت زیادہ تو نہیں ہوتا، لیکن ان میں برقی موٹر لگے ہوتے ہیں۔ ان کی باہیں پانچ یا چھ طرح کی حرکت کر سکتی ہیں۔ ان میں سے تین ہاتھ کے لئے ہوتی ہیں اور تین بانہوں کے لئے ہوتی ہیں۔ عام طور پر ان روبوٹ سے مشینوں کے چھوٹے چھوٹے پرزوں کو جوڑنے کا کام لیا جاتا ہے۔ بعض روبوٹ ایسے ہیں جن سے کارخانوں میں بھاری کام لیا جاتا ہے۔ یہ روبوٹ سو سے دو سو کیلوگرام تک کے وزن کو اٹھا کر دو میٹر کی دوری تک لے جا سکتے ہیں۔ ان کی طاقت ایک انسان کی جسمانی طاقت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ بھاری وزن کو چڑھانے اور اتارنے، ہوائی جہاز کے پنکھوں میں چھید کرنے، ٹرک اور موٹروں کے ڈھانچوں کی جوڑائی کرنے میں ان روبوٹ کا استعمال کیا جاتا ہے، ان کے علاوہ کچھ اور خاص قسم کے صنعتی روبوٹ بھی ہوتے ہیں، جن سے کچھ مخصوص کام لئے جاتے ہیں، جیسے پینٹ کرنے کا کام۔ امریکہ کے اسپیس شٹل (خلائی جہاز) پر رنگ چڑھانے کے لئے انہیں روبوٹ سے مدد لی گئی تھی۔

امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جاپان اور کناڈا وغیرہ ایسے ممالک ہیں جنہوں نے صنعتی روبوٹ کے علاوہ ایسے روبوٹ بنا لئے ہیں، جو سائنسی تحقیق سے منسلک بہت سارے کام انجام دے سکتے ہیں۔ کچھ ایسے روبوٹ بھی ہیں، جو دفاعی اور تجارتی کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں جب ''کنشک'' طیارہ حادثے کا شکار ہوا تھا تو اس کے بلیک باکس کو سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالنے کے لئے اسکریب (Scrab) نام کے روبوٹ کا سہارا لیا گیا تھا۔ ایسے روبوٹ بھی وجود میں آ چکے ہیں جو ریڈیائی شعاؤں سے پر ماحول میں بھی آسانی سے کام کر سکتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں اب تو کپڑے دھونے، بستر بچھانے، میز بچھانے جیسے کاموں کے لئے بھی روبوٹ بنا لئے گئے ہیں۔ کچھ ایسے ممالک ہیں، جنہوں نے ہوائی جہاز اور پنڈولی (آبروز) چلانے والے روبوٹ بھی بنا لئے ہیں۔

خلائی تحقیق کے لئے ایسے روبوٹ بھی ہیں، جو لاکھوں میل دور سیاروں سے زمین پر سائنسدانوں کو معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس کی ایک زندہ مثال Pathfinder ہے، جو ایک روبوٹ ہی ہے اور نہایت خوبی سے مریخ کی زمین پر گھوم گھوم کر تصاویریں بھیجتا، وہاں کی مٹی کا تجزیہ کرتا اور بہت ساری رپورٹ ہمارے سائنسدانوں تک پہونچاتا ہے۔

روبوٹ کا بنانا ایک نہایت ہی پیچیدہ کام ہے۔ اس میں اس کی یادداشت کو قائم رکھنے کے لئے اور فیصلے کی قوت کے لئے بہت سے کل پرزے لگانے ہوتے ہیں۔ روبوٹ میں کئی پیچیدہ برقی سرکٹ ہوتے ہیں، جو مختلف کاموں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان کے لئے ایک مخصوص زبان تیار کی جاتی ہے، جن کے ذریعہ انہیں کام کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ کسی بھی روبوٹ کو بنانے کے لئے یہ طے کرنا ضروری ہوتا ہے کہ اس سے کس کس طرح کا کام لینا ہے۔ کام طے کرنے کے بعد اس کی مشینی حد بندی کی جاتی ہے، پھر ان میں جوڑ (Joint) پکڑ (Holding Capacity) موٹروں کی تعداد اور مختلف قسم کی حرکات کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے مخصوص کمپیوٹروں کا انتخاب بھی کیا جاتا ہے۔

کسی چیز کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنے والی مشین تو کئی ہیں، لیکن روبوٹ میں جب تک کنٹرول سسٹم نہ ہو اس وقت تک وہ روبوٹ نہیں کہلا سکتا۔ روبوٹ میں اس کی باہوں کو اس کی پکڑ کو اور اس کی رفتار کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک مخصوص نظام ہوتا ہے، جو کمپیوٹر سے منسلک ہوتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ کسی روبوٹ کا دماغ ایک مائیکرو کمپیوٹر ہی ہوتا ہے، جس میں وہ سب کچھ محفوظ ہوتا ہے، جو ایک روبوٹ کو کرنا ہے۔

امریکہ میں Macsyma یعنی Mathematical Analyser Calculayor And Symbo Lic Manipulator. نامی ایک روبوٹ بنایا گیا ہے، جو علم ریاضی کے نہایت پیچیدہ سوالات کو بخوبی حل کرتا ہے۔ ان ساری خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود روبوٹ ایک روبوٹ ہی ہے یعنی بندھوا مزدور، انسان کا غلام چاہے کتنا ہی ذہین اور طاقت ور روبوٹ کیوں نہ بنا لیا جائے وہ انسانی ذہن کا غلام ہی رہے گا۔ انسانی دماغ ایک ایسی مشین ہے، جس سے آگے بڑھ کر خود انسان کوئی مشین نہیں بنا سکتا۔

PDF Compressor Free Version

درخشاں جبیں

Alamganj, Ghera, Patna 800007

آوازوں کی آلودگی

آج کل سائنسی ایجادات کی ترقیاں اپنے عروج پر ہیں۔ سائنس دانوں نے طرح طرح کی ایجاد میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ طرح طرح کی گاڑیاں، ریڈیو، ٹی۔وی، کمپیوٹر، موبائل اور نہ جانے کیا کیا کچھ سائنس دانوں کے نت نئے کارنامے ہیں جو ہمیں حیرت میں ڈال رہے ہیں اور ہم سبھی جانتے ہیں کہ ان چیزوں کے اگر ایک طرف بہت سارے فائدے ہیں تو دوسری طرف کچھ نقصانات بھی ہیں۔ مثلاً عالمی پیمانے پر ماحول میں طرح طرح کی آلودگی سائنسی ایجادات سے آئی ہے اور اس کے نقصانات کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔

یہ آلودگی کیا ہے؟ اسے یوں سمجھیں کہ ہم سبھی صاف پانی پینا پسند کرتے ہیں اور اگر پانی میں کسی قسم کی مہک آنے لگے تو اسے نہیں پیتے۔ پانی میں دھول کن بھی مل جاتا ہے جس سے پانی گندا ہو جاتا ہے اور کچھ ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں جو ہمیں ننگی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتیں، ایسی گندگی کو ہم سائنس کی زبان میں آلودگی کہتے ہیں۔ یہ گندگیاں صرف پانی کیا ہوا میں بھی مل جاتی ہیں ان میں وہ چیز شاید سب سے گندی اور خطرناک ہے جسے ''صوتی آلودگی'' کہا جاتا ہے۔ آج کل روز بروز بڑھتا ہوا شور آوازوں کی آلودگی ہے اور یہ آلودگی روز بروز تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ عام طور پر اوسط بول چال کی آواز تو اچھی لگتی ہے، لیکن جب یہی آواز اونچی ہو جائے تو وہ شور بن جاتی ہے اور بہت سے شور ایک ساتھ مل کر جب ابھرنے لگتے ہیں تو آوازوں کی آلودگی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ شور جاندار کی آوازوں کا بھی ہو سکتا ہے اور مشینوں اور گاڑیوں کی آوازوں کا بھی، بہر حال یہ سب حد سے بڑھے تو نقصان دہ ہے۔

آوازیں ہر طرح کی ہوتی ہیں جیسے پرندوں کی چہچہاہٹ، اونچائی سے گرتا ہوا پانی، جنگل میں درندوں کی آواز مثلاً شیر کی دھاڑ اور ہاتھی کی چنگھاڑ، ان میں سے بعض ہمیں اچھی لگتی ہیں اور بعض ڈراونی۔ یہ قدرتی آوازیں ہیں۔ آج کل یہ آوازیں ختم ہوتی جارہی ہیں اور ان کی جگہ ٹرین، ہوائی جہاز، موٹر کار، ٹریکٹر، بس اور طرح طرح کی مشینوں اور گاڑیوں وغیرہ کی آوازوں نے لے لی ہے۔ یہ ایسا شور ہے جو انسان کو ذرا بھی اچھا نہیں لگتا اور اس کے نقصانات بھی بے حد ہیں۔ نئی سائنسی ایجادوں کے ساتھ اب یہ آوازیں شہر سے نکل کر گاؤں تک پہنچ چکی ہیں اور ہر طرف عام ہیں۔

جس طرح کپڑے کو ہم میٹر میں ناپتے ہیں اسی طرح سائنسی طریقے سے آوازوں کو ہم ''ڈیسی بل'' میں ناپتے ہیں۔ جسے عام طور پر مختصر میں ڈی بی کہتے ہیں۔ سب سے کم آواز صرف اتنی کہ پاس کا آدمی سن لے صفر ڈی بی ہوتی ہے اور جب ایک دوسرے سے پھسپھسا کر بات کی جاتی ہے تو وہ ۱۵ ڈی بی یا ۲۰ ڈی بی ہو جاتی ہے۔ گلیوں اور سڑکوں پر جب شور مچتا ہے یا بچے کھیلنے میں شور کرتے ہیں تو اس کی شدت ۷۰ ڈی بی ہوتی ہے۔ کاروں کا ہارن ۴۰ ڈی بی کا ہوتا ہے اور موٹر سائیکل کی آواز ۱۵۰ ڈی بی سے زیادہ ہوتی ہے اسی طرح اور بھاری آوازوں کا ڈی بی بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ۴۵ ڈی بی والی آواز میں لگاتار رہنے سے آدمی بہرا بھی ہو سکتا ہے۔ اٹلی کے ایک سائنس داں ریم زینی نے کئی سو سال پہلے جب کارخانوں میں کام کرنے والے لوگوں کا جائزہ لیا تو بتایا کہ شور میں کام کرنے والے مزدور بہرے ہوتے جارہے ہیں۔ ۲۰۰ ڈی بی آواز سے ماں بننے والی عورتوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ ان کے بچے کمزور پیدا ہوتے ہیں۔ عام انسان کو ۱۲۰ ڈی بی سے زیادہ شور بیماریوں میں مبتلا کر سکتا ہے مثلاً دل کی دھڑکن کی رفتار بڑھ جاتی ہے،

PDF Compressor Free Version

خون کا دباؤ بڑھنے لگتا ہے، دماغ پر بوجھ کی وجہ سے غصہ اور چڑچڑاپن آنے لگتا ہے، خون میں کولسٹرول اور کارٹی سون جیسے زہریلے مادے پیدا ہوجاتے ہیں جن سے دل کی خراب بیماریاں گھیر لیتی ہیں، کان سے کم سنائی دینے لگتا ہے اور ذہن پریشان ہوجاتا ہے۔

سائنس دانوں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ہر دس سال میں شور کا اضافہ دوگنا ہوتا چلا جارہا ہے۔ شور کے اسی اضافے کو دیکھتے ہوئے انگلینڈ میں ۱۹۶۰ء میں ایک قانون نافذ ہوا تھا، جس کے تحت آوازوں کی آلودگی پھیلانے والوں کو جرمانہ دینا پڑتا ہے۔

ہمارے ملک میں بھی آوازوں کی آلودگی کو کم کرنے کے لئے اقدام کئے گئے ہیں۔ کارخانوں کو شہروں سے دور رکھا گیا ہے۔ وہاں کام کرنے والے مزدوروں کو ماسک کے استعمال کی سہولت میسر ہے۔ موٹر کاروں کے استعمال کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ تہوار اور شادی بیاہ میں پٹاخے چھوڑنے سے روکا جارہا ہے، کیونکہ اس کی شدت ۱۲۰ ڈی بی ہوتی ہے جس سے ہمارے کانوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

آوازوں کی آلودگی سے بچنے کے لئے ایک طرف یہ ضروری ہے کہ ہم ایسے کاموں سے بچیں جو صورتی آلودگی لاتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ آلودگی کو ختم کرنے اور اسے قابو میں رکھنے کے اقدامات پر توجہ دیں۔ ہر جگہ پیڑ لگائیں کیوں کہ پیڑوں کی پتیاں آوازوں کو اپنے اندر جذب کرلیتی ہے۔ ریڈیو، ٹی۔ وی، ڈی جے کو دھیرے دھیرے بجائیں۔ اگر ہم ان سب باتوں کا خیال رکھیں گے تو ہمارے ملک میں بھی آوازوں کی آلودگی اوسط درجہ میں رہے گی، جس سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوگا اور ہم سکون کی زندگی بسر کرسکیں گے۔

سلام و پیام (ص ۶۸ سے آگے)

نئے لکھنے والوں کو بھی حوصلہ ملا ہے، اس لئے کہ آپ ہمیشہ ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں، شاید آپ کے دردمند دل کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ باصلاحیت نئے لکھنے والوں کی اگر حوصلہ افزائی نہیں کی گئی، ان کے کاندھوں کو ''زبان وادب'' کی امانت کو سنبھالنے کے لئے تیار نہیں کیا گیا تو اس پیاری زبان کی ترویج و اشاعت تو دور کی بات ہے، اس کی وراثت کو سنبھالنا بھی آنے والے دنوں میں مشکل ہوجائے گا۔

امتیاز دانش، جھریا

☆ بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ ''زبان وادب'' آپ کی خوش ذوقی کا عکاس ہے۔ یہ رسالہ فنی اور فکری دونوں اعتبار سے بہت معیاری ہے۔ اس میں آپ کی دوربینی اور صحافتی مہارت نے مزید چار چاند لگا دئے ہیں۔ تمام اراکین و معاونین کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ نت نئی تبدیلیوں کی بدولت ''زبان وادب'' کی دیدہ زیبی اور دلکشی میں بتدریج نکھار آتا جارہا ہے اور اس کی شہرت و مقبولیت بڑھتی جارہی ہے۔ جب کہ کتنے رسائل دم توڑ رہے ہیں۔ خدا کرے ''زبان و ادب'' کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے اور یہ رسالہ اردو زبان وادب کی فلاح و بہبود کا پائیدار ذریعہ بنا رہے..... آمین!

ذکی ہاشمی، گوپال گنج

☆ ''زبان و ادب'' ماہ فروری ۲۰۱۶ء ملا۔ حسب معمول یہ ماہنامہ خوبصورت ٹائٹل پیج اور اعلیٰ تخلیقات کے ساتھ منظر عام پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس شمارہ میں ڈاکٹر مشتاق احمد، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر احمد قادری، کوثر مظہری اور ڈاکٹر سید ارشد اسلم کے مضامین پسند آئے۔ اقبال سلیم، احمد کلیم فیض پوری، نورالحسنین اور امین صدرالدین بھایانی کے افسانے نے بھی ذہن کو جھنجھوڑ دیا۔ شکر کیموری کی حمد و نعت بہت خوب ہے۔ ان کے یہ اشعار بہت پسند آئے۔

مالک ہے وہ اس دھرتی کا، مالک ہے کہساروں کا
کر کے مطالعہ دیکھ چکے ہیں ہم قرآن کے پاروں کا

میرے سپنے خواب تمہارے سب کا مالک اللہ ہے
خدایا دونوں تیرے ہیں ، وہ کعبہ ہو کہ طیبہ ہو
ترے جلووں کی تابانی ، یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے

دیگر غزلیں بھی معیاری ہیں۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی بلندی کی طرف پرواز کرتا جارہا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کی محنت کا پھل ہے۔

اسلام احمد شاہی، بھاگلپور

PDF Compressor Free Version

شاہ زماں حق

Associate Professor of Sociolinguistics Inalco, Paris

لفٹ کی سیر

یہ تقریباً اس زمانے کی بات ہوگی جب میری عمر دس بارہ سال کے قریب تھی۔ گھر سے پانچ منٹ کے راستہ پر ایک بہت بڑا میدان تھا جہاں میں اکثر شام کے وقت محلہ کے لڑکوں کے ساتھ کرکیٹ کھیلنے جاتا تھا۔ ایک روز جب ہم لوگ کھیل ختم ہونے کے بعد واپس آرہے تھے تبھی راستے میں ایک لڑکے نے خوشی سے چلا کر ہم لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

''ارے یہاں دیکھو، ایک کمرہ اوپر جارہا ہے۔'' یہ سنتے ہی مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ہم سبھی لوگ اس جانب بڑھے۔ یہ ایک سنیما ہال کی عمارت تھی جس کے ایک حصہ میں کچھ منزلوں میں مختلف دفتر مقیم تھے۔ اس حصے کا آستانہ علیحدہ تھا۔ فرط اشتیاق اندر گھستے ہی جو میں نے دیکھا اس سے ہماری آنکھ پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

یہ ایک کمرہ تو نہیں بلکہ وہاں ایک چھوٹا جوف دار خانہ نظر آیا جس میں لوگ داخل ہوتے اور اس خانہ کی دوہری لوہے کا جنگلہ نما دروازہ بند ہوتے ہی خانہ اوپر کی طرف چلا جاتا۔ میں بڑا حیران ہوا اور میں نے سوچا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ بعد میں میں نے جب سینئر لڑکوں سے اس حیرت انگیز خانہ کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ لفٹ ہے، پھر میری خواہش ہوئی کہ اس لفٹ کا سفر کیا جائے۔ میرا اسکول، گھر اور اس عمارت میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ پنج شنبہ کے روز اسکول سے واپسی کے دوران میں نے دونوں دوستوں کو اکسایا کہ لفٹ کا لطف لیا جائے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں پر کوئی نہیں تھا۔

ہم تینوں لفٹ کے اندر داخل ہوئے۔ لوہے کے پٹ کو کھینچ کر بند کیا اور کسی ایک بٹن کو پرجوش انداز میں دبا دیا۔ لفٹ اوپر کی طرف پروان کی، لیکن کچھ ہی لمحوں میں ہولے سے بیچ راہ میں اٹک گئی۔

ہم تینوں کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور ہم لوگوں نے سارے بٹن بے تحاشہ دبانا شروع کر دیا۔ میں اور میرے ایک دوست کا ڈر کے مارے اتنا برا حال تھا کہ ہم گرم فغان میں مبتلا ہو گئے۔ ہمارے دوسرے دوست نے کچھ ہمت دکھائی۔ اس نے زور زور سے ''بھیا بھیا'' چیخنا شروع کر دیا۔ وہ کہنے لگا ''کوئی ہے؟ ہماری مدد کرو۔''

اسے دیکھ کر میرے پہلے والے دوست نے رونا بند کیا۔ اپنی آنکھوں کو موندتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو جوڑا اور سنسکرت میں پوجا کرنا شروع کر دیا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی ایک درود شریف کا مقالہ کر لوں۔ ہم دونوں بڑی شدت سے اپنے اپنے آقاؤں کو یاد کرنے لگے۔

اچانک کچھ دیر میں لفٹ حرکت میں آگئی۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی مانو کہ ہمیں سکون قلب مل گیا، مگر لفٹ کی رفتار خلاف معمول بہت تیز تھی۔ یہ کافی زور سے پہلے تو اوپر کی طرف گئی اور پھر دگنی رفتار سے نیچے کی طرف گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی جھولے پر سوار ہوں۔ ہم تینوں لفٹ کے اس انوکھے سفر کا ہنس ہنس کر مزا لینے لگے۔ پھر لفٹ اپنی پوری رفتار سے سب سے آخری منزل میں آکر موقوف ہوگئی۔

لفٹ کے باہر ایک آدمی خوب موٹا ڈنڈا لے کر کھڑا تھا، اس کے ساتھ دو تین آدمی اور کھڑے تھے۔ یہ سبھی ہمیں غصہ سے گھور رہے تھے۔ جیسے ہی ہم لفٹ سے باہر نکلے، اس ڈنڈے والے شخص نے ہم تینوں کو بہت ڈانٹ پلائی۔ پھر اس نے ہم تینوں کے کانوں کو بڑے زور سے اینٹھا۔ ہم لوگوں نے کراہتے ہوئے وعدہ کیا کہ آئندہ سے اس لفٹ میں ہرگز قدم نہ رکھیں گے۔ لفٹ کی فرحت بخش مختصر سیر کی قیمت کافی مہنگی پڑی۔ کانوں کی لالی اس کی چشم دید گواہ تھے۔

PDF Compressor Free Version

م۔آصف آروی

رکشہ والا

اک نوجواں بچارہ رکشہ چلا رہا تھا گرمی کا تھا زمانہ خود کو جلا رہا تھا
سر سے پسینہ چل کر تلوے تک آرہا تھا بچپن کا کھیل شاید اس کو ستا رہا تھا
غمگین تھا بچارہ ، آنسو بہا رہا تھا

یہ میں نے اس سے پوچھا بتلاؤ تو خدارا بچپن کا وقت پڑھ کر تم نے نہ کیوں گزارا
والد کا کیا تمہارے سر پر نہ تھا سہارا بچو سنو گے تم بھی وہ جو بتا رہا تھا
غمگین تھا بچارہ ، آنسو بہا رہا تھا

اس نے کہا کہ اپنا کیا ماجرا سناؤں اپنے کئے کی آخر کیسے سزا نہ پاؤں
کس طرح گزرا بچپن ، سچ بات میں بتاؤں گھنٹی بجا بجا کر بڑھتا بھی جا رہا تھا
غمگین تھا بچارہ ، آنسو بہا رہا تھا

کہنے لگا کہ مکتب ناغہ کیا برابر والد نے خوب چاہا پڑھ کر بنوں میں افسر
میں کھیلتا تھا لیکن ان کی نظر بچا کر لٹو نچا رہا تھا ، گڈی اڑا رہا تھا
غمگین تھا بچارہ ، آنسو بہا رہا تھا

استاد ، باپ ، ماں کو دشمن نہ گر سمجھتا اس ڈانٹ اور چھڑی کو لعل و گہر سمجھتا
انجام کا ذرا بھی زیر و زبر سمجھتا اپنا دیا خود اپنے ہاتھوں بجھا رہا تھا
غمگین تھا بچارہ ، آنسو بہا رہا تھا

میری کتاب کوئی رہتی نہ تھی سلامت دوچار دس ورق پر آتی تھی جلد آفت
ہوتی مری بھی عزت کرتے جب اس کی عزت اپنی زباں پہ سچی ہر بات لا رہا تھا
غمگین تھا بچارہ ، آنسو بہا رہا تھا

بچو ذرا سنبھل کر اپنے قدم اٹھاؤ غفلت کا ساتھ دے کر ناکام ہو نہ جاؤ
اس زندگی سی آصف مت زندگی بناؤ کتنی مشقتوں سے پیسے کما رہا تھا
غمگین تھا بچارہ ، آنسو بہا رہا تھا